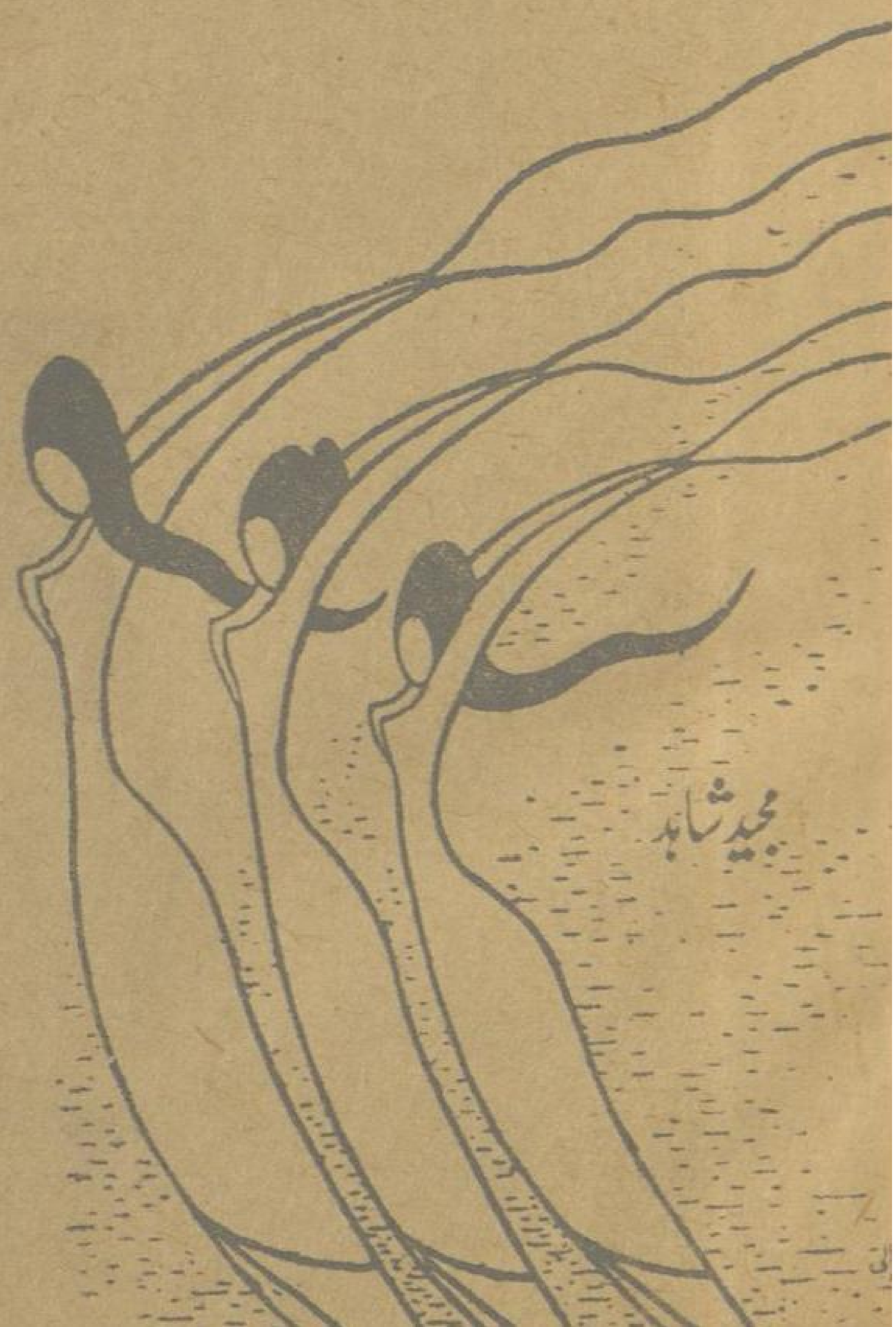

اڑان
مجید شاہد

دیوانِ غزلیات

اُڑان



۱۹۵۹

مطبع ۔ نقوش پریس ۔ لاہور

ناشر ۔ ملک مبارک علی
گوشہ ادب ۔ لاہور

قیمت ۳-۸-۰

دوستوں کے نام



تاریخِ ادب جس سے مرصّع ہوئی شاہد
وہ ہیئتِ افکار غزل صرف غزل ہے!

حرفِ اوّل

گذشتہ رُبع صدی سے شعر و سخن کے نقّاد غزل سے متعلق دو نظریات کو تنقید کی اساس قرار دیئے ہوئے ہیں ۔ اوّل یہ کہ غزل داخلیّت اور وجدان کی قیود سے نجات پاکر خارجیت اور ماحول کی ریشہ دوانیوں کی آلۂ کار بنی ہوئی ہے اور دوئم یہ کہ دورِ حاضرہ کی مقتضیات غزل کے وجود کو برداشت نہیں کر سکتیں ۔ دوسرے نظریہ کی بنیاد اکثر نقّاد غالبؔ کے اس شعر کو قرار دیتے ہیں کہ

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیئے وسعت مرے بیاں کے لئے

لیکن حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ اپنے دور میں اپنی جس انفرادیّت کو

قائم رکھنے کا خواہشمند تھا۔ اُس کے اجزائے ترکیبی سے اُس کے ہم عصر برسرِ پیکار تھے۔

جن خیالات اور عقل و وجدان کی جن اقدار کا جس انداز سے وہ تجزیہ کر رہا تھا۔ اس دور کا اسلوبِ تغزل اس کی اجازت نہ دیتا تھا۔ اس لئے "تنگنائے غزل" سے اس کی مراد مروجہ اسلوبِ اظہار اور طرزِ فکر تھی اس نے اس سے یہ مقصود کبھی نہیں لیا۔ کہ غزل اظہارِ بیان کا نامکمل ذریعہ ہے۔ بلکہ اس کا مقصد یہ تھا کہ ایما، رمز، کنایہ، تشبیہہ، اور اِستعارہ جتنے بھی غزل کے اجزا ہیں۔ اُنھیں سطحی جذبات کا تابع نہ رہنے دیا جائے۔

بنا بریں غالب نے غزل کو جذباتِ لطیف کی واردات اور مشاہدات کے ساتھ ساتھ فلسفۂ حیات اور خارجی و اکتسابی مدرکات و محسوسات کے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ ظاہر ہے کہ اس دور کی غزل کا مزاج اس کھلی بغاوت کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے اس کے اکثر اشعار ناسازگار ماحول کے ردِّ عمل کا نتیجہ ہیں۔ البتہ غالب نے جہاں بھی اپنے اشعار میں فلسفہ اور خارجیت کو سمویا ہے۔ وہ اتنا برہنہ نہیں کہ ذہن و ادراک پر گراں گذرے۔ بلکہ اس کے برعکس اس کا پیرایۂ اظہار اس قدر لطیف اور زبان اتنی شیریں ہے کہ شعری مقتضیات اور فکری تجربات

کہیں بھی جمالیاتی حسن سے محروم دکھائی نہیں دیتے۔

شعر ایک صداقت ہے اور صداقت حسن۔ جب تک ادراکِ حسن اقدارِ حیات کے احساس و توازن کو برقرار رکھنے کا ذریعہ نہ بنے صداقت مبہم رہتی ہے۔ اظہارِ صداقت کے لئے رمز و کنایہ، ایماء و اشارہ اور تشبیہہ و استعارہ کو رسمی طور پہ استعمال کرنا دراصل صداقت کو اپنے اصلی خد و خال سے محروم کر دینا ہے۔ شعر کے بانکپن اور اظہار کے حسن کو برباد کر دینا ہے اور انہی پابندیوں اور سطحیت کو تنگنا کہہ کر غالب نے محسوس کیا کہ وسعتِ بیاں کے لئے کچھ اور چاہئے۔ ان تصریحات سے ظاہر ہوا کہ اصنافِ شعر میں غزل ہی داخلی اور خارجی واردات کا حقیقی محور اور مظہر ہے اور ہر دور اور ہر ماحول میں غزل کا وجود لازمی اور لابدی ہے۔

ہمارا دور کچھ ایسے عناصر سے ترکیب پا گیا ہے۔ جہاں داخلیت کم اور خارجیت زیادہ ہے۔ اس لئے وارداتِ فکر کے جمالیاتی جز کو خمارِ محض اور سرمستیٔ مطلق تک ہی محدود نہیں رکھا جا سکتا۔ چنانچہ میں نے ایک شاعر کی حیثیت سے جب بھی کہا اور جو کچھ بھی کہا۔ میرے تخیل و فکر پہ خارجیت اس حد تک مسلط رہی۔ جس حد تک میرے گرد و پیش اور میرے دور کے استمرار کا تقاضا رہا۔ میں نے مشرق اور مشرق کے اس خطۂ جمال و

رنگ میں صبحِ زندگی کی پہلی روشنی دیکھی جو "شہرِ سبز" کے نام سے اب بھی ماضی کی تاریخ میں محفوظ ہے۔ سرزمینِ "توران" کا یہ شاداب اور بہار آفریں علاقہ چار سال تک میرا گہوارۂ حیات رہا۔ اس کے بعد میری زندگی اس عظیم خطۂ ارض سے وابستہ ہو گئی۔ جہاں کی خار افگنیاں بھی نرم و نازک بن کر محسوساتِ حیات کے رگ و پے میں پیوست ہوا کرتی ہیں۔ خیبر کی وادی ــ پشاور ــ مشرق کا ایک حسین مگر سادہ و پُرکار خطّہ میرا مسکن ہے۔ یہیں میرے شعور نے آنکھ کھولی اور یہیں میری زبان لبوں سے ہم آہنگ ہوئی۔ میں نے "تنگنائے غزل" ہی کو اپنے بیان کے لئے وسعت قرار دیا اور غزل کے روپ میں ہی اپنے خارجی اور داخلی ماحول کو پیش کیا۔ زندگی کے کرب و اضطراب، گردشِ ایام کی سختی و نرمی، حضورِ حسن و جمال میں جوانی کی سپردگی، غرض نگاہ جہاں اٹھی اور جس انداز میں اٹھی اس میں مشرقیت اور مشرق کی دلآویزی و فسوں کاری روحِ جذبات بن کر رواں دواں رہی ہے۔

موجودہ آدابِ تنقید میں شعوری اور غیر شعوری شاعری کا غیر منطقی مسئلہ بعض نقادوں نے لا کھڑا کیا ہے۔ لیکن ذاتی طور پہ میں شعوری اور غیر شعوری شاعری کی اصطلاحات کا قائل نہیں اور یہ افتراق و امتیاز میرے نزدیک محض ایک اُپج ہے اور کچھ نہیں۔ شعر بجائے خود شعور کا نام ہے اور

کوئی غیر شعوری کلام شعر ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ شعر کی تخلیق لاشعور میں ہوا کرتی ہے اور شعور اسے منصۂ اظہار پر لاتا ہے۔ شعور سے عاری ریت تو محض دوختہ لبی اور نطق و بیاں کی ضد ہے اور میں نے جو کچھ کہا ہے اس جدید غیر منطقیت سے مبرا ہے۔

میں سنِ شعور کی ابتدائی منزلوں سے ہی شعر کہہ رہا ہوں۔ اس دوران میں جن فنکاروں سے بہ غرض مشورہ رجوع کیا۔ ان میں سے حضرت احسان دانش کا یہ قول میرے شعورِ فن اور پختگیٔ فکر کی بنیاد ٹھہرا کہ "مطالعہ سب سے بڑا استاد ہے"۔ اُن کا یہ مخلصانہ مشورہ میری حیاتِ سخن کی ہر منزل پر میرا ممد و معاون رہا۔

زیر نظر مجموعہ تقریباً ایک دیوان کی شکل میں ترتیب دیا گیا ہے۔ اور اُردو شاعری کی قدیم و جدید روایات پر مشتمل ایک تجرباتی پیش کش ہے۔ جہاں میں نے اس قدیم روایت کے تتبع اور احیاء کے لئے اس کتاب کو بقیدِ ردیف مرتب کیا ہے جو حسرتؔ اور بیخودؔ کے بعد تقریباً متروک قرار دی جا چکی ہے۔ وہیں فیضؔ کی اُس روش کو اپنایا ہے۔ جو اُنھوں نے "دستِ صبا" کی اشاعت کے وقت دیباچہ یا پیش لفظ کے معاملے میں اختیار کی۔

موجودہ دور میں تقریظ اور پیش لفظ یا اس نوع کے دوسرے تعارفی

تبصرات اگرچہ اُن تقریظات سے قدرے مختلف ہیں۔ جو قدیم اُردو ادب کی مطبوعات کے لیئے ضروری سمجھی جاتی تھیں اور متقدمین کے ہاں رائج تھیں۔ تاہم میں ذاتی طور پر اس چیز کو پسند نہیں کرتا اور نہ ہی ایک کتاب کی طباعت کے وقت کسی یگانۂ عصر یا منفرد اہل قلم سے پیش لفظ کے طور پر چند مدحیہ صفحات لکھوا لینا کوئی ادبی خوبی ہے۔ کیونکہ ایک شخص کی ذاتی رائے بہت سے پڑھنے والوں پہ ٹھونسنا قارئین کے مذاق و تمیز کے ساتھ استہزا ہے۔ انہی مسلمات کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے خود ہی مختصر سا ابتدائیہ لکھنے پر اکتفا کر کے باقی تمام باتیں قارئین پہ چھوڑ دی ہیں۔

میری شاعری کا حقیقی دور ۱۹۴۷ء کے بعد شروع ہوا اور اب تک میں نے جو کچھ کہا ہے۔ اس کا انتخاب آپ کے سامنے ہے۔ اس مجموعے کی تزئین اور آراستگی فکر میں میرے جن دوستوں کے اخلاص کا حصّہ ہے یہ کتاب اُن کی محبت بھری یاد کو ہمیشہ تازہ رکھے گی۔

پشاور — مجید شاهد

۶ر جنوری ۱۹۵۵ء

تاریخِ ادب جس سے مرصّع ہوئی شاہدؔ
وہ ہیئتِ افکارِ غزل صرف غزل ہے

شاہدؔ

ا

ب

پ

ت

ٹ

ث



○

اے چارہ گرو کوئی بہانہ، کوئی حیلا
اب درد ہے خود کاوشِ درماں کا وسیلا

چھیڑا ہے ستاروں نے پھر اِک راگ سُریلا
ساغر کوئی ہمرنگِ مہِ نیم شبی لا

چھائی ہے خرابات پہ اِک سانولی بدلی
میں بھی ہوں نشے میں کہ ہے موسم بھی نشیلا

رہنے دو ابھی کاکلِ برہم نہ سنوارو
اور اک پہ طاری ہی رہے خواب رسیلا

اک جام پہ مرکوز ہیں کونین کی نظریں
اللہ رے ساقی ترے اوصافِ جمیلا

ہیں اہلِ خرابات مگن اپنی ہی دُھن میں
حالات کا پابند نہیں ہے یہ قبیلا

کہتا ہے جسے شاہدِ گل سارا زمانہ
وہ شاعرِ خوش فکر جواں بھی ہے سجیلا

○

محوِ نظّارۂ جمال رہا
دل بھی آنکھوں کا ہم خیال رہا

دیکھ کر جام میرے ہاتھوں میں
گردشوں کو بڑا ملال رہا

تھی ستاروں میں روشنی جب تک
اُن کے آنے کا احتمال رہا

روشنی اس کے بعد کیا ہو گی
صبح نو کا اگر یہ حال رہا

عُمر بھر زندگی کے سینے میں
اِک دھڑکتا ہوا سوال رہا

وقت کی دُھوپ چھاؤں میں شاہد
ایک غم تھا جو لازوال رہا

—

○

اضطرابِ شوق جب وجہِ سکونِ دل ہُوا
ہر قدم پر کارواں آسودۂ منزل ہُوا

جل اُٹھے پلکوں پہ سوزِ دل سے اشکوں کے چراغ
یُوں بھی اکثر اہتمامِ گرمیِ محفل ہُوا

عشق کی وارفتگی ٹھہری حجابِ درمیاں
یعنی ہر تارِ نظر خود پردۂ محمل ہُوا

مرحلے کچھ التفاتِ حُسن کے مُشکل نہ تھے
عشق اکثر آپ اپنی راہ میں حائل ہوا

آگیا مجھ کو جنوں کی وضعداری کا خیال
جب بھی دل تیری نگاہِ ناز کے قابل ہوا

کس لئے کوئی پشیماں ہو خطائے شوق پر
کچھ نہ کچھ تو سعیِ لاحاصل سے بھی حاصل ہوا

سطح تک محدود تھی ہر موجِ بحرِ زیست کی
وقت خود شاہد کبھی طوفاں کبھی ساحل ہوا

—

○

جذبِ دل جب بروئے کار آیا
کاکُلِ زندگی سنوار آیا

تھا نہ کچُھ بھی بجُز غبارِ نظر
میں تجھے دُور تک پکار آیا

بازیِ عشق دل نے یوُں جیتی
ساتھ اپنے مجھے بھی ہار آیا

تجھ کو دیکھا تھا میری آنکھوں نے
اپنی آنکھوں پہ مجھ کو پیار آیا

وہ خرابات میری جنّت ہے
میں جہاں شامِ غم گذار آیا

تیرے اِک بار مسکرانے سے
زندگی پہ بڑا نکھار آیا

ایک مُدّت کے بعد گلشن میں
دُھوم ہے شاہدِ بہار آیا

—

○

بدلیاں تھیں کہ سنورتا ہوا میخانہ تھا
بے پئے بھی تو کوئی ہوش سے بیگانہ تھا

میری وارفتہ نگاہی کو نہ دیکھا تُو نے
ایک میں ہی تو تری بزم میں دیوانہ تھا

آج اُس دل کو بھی ہے تنگیٔ داماں کا گلہ
جو کبھی وسعتِ کونین سے بیگانہ تھا

غیر تو خیر مری ذات سے ناواقف تھے
کیا مجھے بزم میں تُو نے بھی نہ پہچانا تھا

تو بھی اے صبحِ وطن سوختہ ساماں نکلی،
بے سروپا ترے معیار کا افسانہ تھا

دیدنی ہے مرے اشکوں کی بہار اب بھی مگر
اِنقلابات کو یُوں ہی نہ گزر جانا تھا

زندگی خوابِ پریشاں ہے یہاں بھی شاہد
ہم چلے آئے کہاں اور کہاں جانا تھا

○

تجھے کیوں وفا کے تخئیل نے گھیرا
یہ ظالم زمانہ نہ تیرا نہ میرا

ترے غم سے مانوس سا ہو چلا ہوں
ترا غم کہیں دل نہ بن جائے میرا

وہی بدگمانی، وہی بے نیازی
کبھی آپ نے بات کا رُخ نہ پھیرا

نمایاں ہے اُن کے لبوں پر تبسّم
ٹھہر ! کیسی ہو رہا ہے سویرا

ادھر توبہ شاہدؔ نے کی میکشی سے
اُدھر گلشنوں کو گھٹاؤں نے گھیرا

—

○

جو مجھے سمجھتے ہیں درخورِ ستم تنہا
تیری بزم میں ہوں گے وہ بھی دمبدم تنہا

راز کھل گئے سارے دوری و حضوری کے
رکھ لیا غمِ دل نے عشق کا بھرم تنہا

تیری یاد نے آکر انجمن بسا ڈالی
سر جھکائے بیٹھے تھے ورنہ کب سے ہم تنہا

دوست آشنا کیا ہیں گھٹتے بڑھتے سائے ہیں
ہم نبھائے پھرتے ہیں اب تو وضعِ غم تنہا

وہ جو ظلمتِ شب سے ایک ساتھ اُبھرے تھے
گردِ راہ نے پایا اُن کو صبحدم تنہا

کارواں کے دم سے ہی ربطِ راہ و منزل ہے
چل کے دیکھ لے کوئی ایک دو قدم تنہا

میکدے کی رونق ہے ہم پہ منحصر شاہد
کاسۂ سفالیں ہے ورنہ جامِ جم تنہا

○

گو عشق ہے جاں پہ کھیل جانا
مانع تھی خرد پہ دل نہ مانا

کیوں تذکرۂ بہار سن کر
لو دینے لگا ہے آشیانا

میں اپنی ہی جستجو میں گم ہوں
ہے تیری تلاش اک بہانا

اب وقت ہی فیصلہ کرے گا
ناداں ہے جنوں کہ عقل دانا

اے شہرِ طرب کے رہنے والو
بے رحم ہے گردشِ زمانا

پرواز، کہ حلقۂ چمن میں
بنیادِ قفس ہے آشیانا

ہر حادثۂ حیات شاہد
انساں کے لئے ہے تازیانا

○

اسیرِ زُلفِ بُتاں ہو گئی تو کیا ہو گا
حیات خوابِ گراں ہو گئی تو کیا ہو گا

دلوں سے کھیلنے والو ذرا خیال رہے
کوئی اُمنگ جواں ہو گئی تو کیا ہو گا

رہینِ گریۂ شبنم ہے گرچہ خندۂ گُل
مگر یہ رسمِ جہاں ہو گئی تو کیا ہو گا

حکایتِ غمِ دوراں کہ لب تک آ نہ سکی
متاعِ دل زدگاں ہو گئی تو کیا ہو گا

زباں خموش سہی پھر بھی آنکھوں میں
حدیثِ درد بیاں ہو گئی تو کیا ہو گا

وہ اک خلش جو اُبھرتی ہے پے بہ پے دل میں
دلیلِ راحتِ جاں ہو گئی تو کیا ہو گا

ادا شناسِ چمن ہی نہیں کوئی شاہد
بہار نذرِ خزاں ہو گئی تو کیا ہو گا

○

تمام عمر دل کے داغ میں سنوارتا رہا
کسی کی یاد کے نقوش تھے اُبھارتا رہا

کبھی غمِ حبیب بن گیا کبھی غمِ جہاں
مزاجِ دل طرح طرح کے رُوپ دھارتا رہا

نفس نفس رہی شریکِ حال اپنی آرزُو
قدم قدم اگرچہ تُو مجھے پُکارتا رہا

بہائے دل تو کیا ہنسی خوشی متاعِ زیست بھی
بصد خلوص میں ترے حضور ہارتا رہا

وہ اب اُٹھائے پھر رہا ہے زندگی کی نعمتیں
رُخِ حیات کو جو مُدّتوں نکھارتا رہا

بیادِ عارضِ حسیں بہ ربطِ زُلفِ عنبریں
مجیدؔ شاہدِ اپنے روز و شب گزارتا رہا

—

○

نہ نیند آئی نہ یاد آئی نہ لب پہ کوئی نام آیا
جہانِ آرزو میں ایک ایسا بھی مقام آیا

بھری برسات سے ہے بادۂ گلرنگ تک مستی
وہ پھر خود رفتگی کا موسمِ رنگیں خرام آیا

خدا رکھے مرے ذوقِ طلب کی وضعداری کو
جہاں بھی میں رہا میری طرف لہرا کے جام آیا

برنگِ موجِ بوئے گل بطرزِ نغمۂ بلبل
بنامِ زندگی گلشن پرستوں کا پیام آیا

مری وارفتگی جب سرحدِ ادراک سے گذری
تو میرا جذبۂ دل ہر قدم پر میرے کام آیا

ہوئیں آراستہ گردونواحِ دیدہ و دل ہیں
ستاروں کا کوئی پیغام جب ذرّوں کے نام آیا

چلی اب کے برس بادِ بہار ایسی کہ گلشن سے
نہ کانٹوں کی خبر آئی نہ پھولوں کا سلام آیا

قفس ہے خندہ بر لب رقص میں صیّاد ہے شاہد
کہیں پھر طائرِ آزاد کوئی زیرِ دام آیا

○

اِک تبسّم اور وہ بھی زیرِ لب
یاد ہے دل کے مچلنے کا سبب

مشتغلِ ذوقِ جنوں ہوتا ہے جب
زندگانی کے بدل جاتے ہیں ڈھب

دیر ہو کعبہ ہو یا بُت خانہ ہو
راستے ہیں ایک ہی منزل کے سب

حُسن رسوا انجمن در انجمن
اور عشق آوارۂ راہِ طلب

حد سے گذریں شوق کی بیتابیاں
اب غمِ ارزانی بھی ہے وجہِ طرب

ارتباطِ نُور و ظلمت دیکھئے،
صبح کے دامن میں خوابیدہ ہے شب

جل اٹھا پروانہ سوزِ رشک سے
وصل کا ہنگام اور یہ تاب و تب!

زندگی اُن مرحلوں میں ہے جہاں
شامِ غم ہے رُو کشِ صبحِ طرب

—

○

مصلحت کوشی کے معنی ہیں گریز و اجتناب
اور اُبھرے گا دبانے سے شعورِ انقلاب

ایک ہی انداز کی حامل ہیں ساری گردشیں
گردشِ حالات ہو یا گردشِ جامِ شراب

عالمِ تخئیل میں وہ یوں ہیں مصروفِ خرام
پھول کوئی تیرتا ہو جس طرح برسطحِ آب

عظمتِ انساں سے ہے ناآشنا انساں ابھی
ورنہ اُٹھ جائے زمانے بھر سے رسمِ انقلاب

جانے مجھ کو گردشِ حالات لے آئی کہاں
ذہن کی اُلجھن رہی باقی نہ دل کا اضطراب

آؤ آزادی کی تہمت بھی اُٹھا کر دیکھ لیں
چاہیئے یکرنگیِ امروز و فردا کا جواب

ہم نے دیکھے تھے کھُلی آنکھوں جو عہدِ ہوش میں
آج تک شرمندۂ تعبیر ہیں شاہد وہ خواب

○

ہجومِ دل زدگاں ہے، چلے چلو چُپ چاپ
کسی کو ہوش کہاں ہے، چلے چلو چُپ چاپ

زباں خموش ہو، نیچی نظر ہو، سر خم ہو
یہ رسمِ کوئے بتاں ہے، چلے چلو چُپ چاپ

نہیں کسی کو خبر واقعاتِ عالم کی
طویل کارِ جہاں ہے، چلے چلو چُپ چاپ

نہ داغِ دل ہی دکھاؤ نہ حالِ غم ہی کہو
یہ دورِ کم نظراں ہے، چلے چلو چُپ چاپ

وہ شے، خلوصِ یقیں ہم نے جس کو سمجھا تھا
ہنوز وقفِ گماں ہے، چلے چلو چُپ چاپ

اگر مذاقِ طلب ہو تو فرشِ خاکی بھی
بساطِ کاہکشاں ہے، چلے چلو چُپ چاپ

وہ کوئی موڑ ہے منزل نہیں جہاں شاہد
بہار ہے نہ خزاں ہے، چلے چلو چُپ چاپ

○

اللہ رے وہ گردشِ چشمِ سیاہ مست
ساری فضا ہے تا بہ حدودِ نگاہ مست

گذرا ہے کون ڈوب کے کیفِ شباب میں
ہر رہگذر نشے میں ہے ہر شاہراہ مست

پھینکی ہے کس نے تا بہ ثریّا کمندِ ناز
انگڑائیوں کے کیف سے ہیں مہر و ماہ مست

یہ میکدہ ہے حلقۂ پیرِ حرم نہیں
رہتے ہیں اس جہاں میں گدا مست شاہ مست

وہ اختیار میں ہیں نہ دل اختیار میں
پھر بھی ہیں اہلِ عشق بحالِ تباہ مست

شاہدؔ ہزار دُور ہوں بزمِ مغاں سے ہم
ہوتے ہیں گاہ ہوش میں رہتے ہیں گاہ مست

○

عشق میں ننھے وحشت کے علاوہ اور بھی دل کو کام بہت
عہدِ وفا ہم کر کے تجھ سے دوست ہوئے بدنام بہت

آنکھ سزاوارِ حیرت ہے اس پہ بھی معتوب نہیں
دل کتنا محتاط ہے پھر بھی دل پہ ہیں الزام بہت

سب سے جدا اوصاف کی حامل تیری آنکھیں ہیں ساقی
ورنہ یوں تو میخانے میں رقص کناں ہیں جام بہت

مجھ کو ذرا بھی راس نہیں آسودگیِ دل کی باتیں،
رنج بہت ہیں راحت میں تکلیف میں ہے آرام بہت

پتّے، گُل بوٗٹے، ہریالی، سب کا دشمن ہے مالی
گلشن گلشن ڈالی ڈالی پھیل رہے ہیں دام بہت

اور کوئی اے فتنہ گرو، اب طرزِ ستم ایجاد کرو
قریہ قریہ، بستی بستی منظرِ غم ہے عام بہت

ہوش ہیں ہے یا دیوانہ ہے شمع ہے یا پروانہ ہے
دل کے ہاتھوں شاہدؔ پر دُنیا نے دھرے ہیں نام بہت

○

اے جرأتِ نگاہ کوئی تازہ واردات
اُلجھے ہوئے ہیں عقل و جنوں کے معاملات

حائل رہیں ہزار حدودِ تعینات
مرہونِ یک نگاہ ہے تسخیرِ شش جہات

ہر بزم میں جنوں کے مظاہر ہیں آج کل
اللہ رے کشاکشِ دانش گہِ حیات

یہ صورتِ تضاد دلیلِ سحر نہ ہو
ظلمت عروج پر ہے مگر ڈھل رہی ہے رات

اشکوں میں ہیں دلوں کے سفینے رواں دواں
رو میں ہے آج دیکھئے سیلِ تغیرات

جامِ جہاں نما ہے فقط ظرفِ آگہی
پروردۂ مذاقِ نظر ہے یہ کائنات

وہ بوستانِ شوق ہے محرومِ رنگ و بُو
فکر و نظر جہاں ہوں اسیرِ توہمات

ہر حادثہ ہے باعثِ تکمیلِ زندگی
شیرازہ بندِ شوق ہے نیرنگِ واقعات

ہیں روشناسِ لالہ و گل داغہائے دل
منت کشِ بہار نہیں شاہدِ حیات

○

سرو و چنار و برگ و گُل و یاسمن کو لُوٹ
اہلِ چمن سے ربط بڑھا کر چمن کو لُوٹ

اِنساں جہاں خلوص سے مصروفِ کار ہو
بیداد و ظلم و جبر سے اس انجمن کو لُوٹ

آئینِ اختیار کی تکمیل کے لئے
دستورِ نو کو لُوٹ نظامِ کہن کو لُوٹ

آزادیٔ نفس کا جہاں احتمال ہو
اُس آشیاں کو آگ لگا اُس چمن کو لُوٹ

وہ حُسنِ ظن، جو ہے ترے بارے میں خلق کو
شاؔہد کا مشورہ ہے کہ اُس حُسنِ ظن کو لُوٹ

○

گردشِ صبح و شام کے وارث
رہ گئے صرف نام کے وارث

شمع ہو ، رند ہوں کہ پروانے
سب ہیں سوزِ تمام کے وارث

آخرش بٹ گئے گروہوں میں
اجتماعی نظام کے وارث

حیف اے نوبہارِ آزادی
تیرے وارث ہیں نام کے وارث

گرد نشیں مصلحت شناس نہیں
اے بقائے دوام کے وارث

باوجودِ تغیّراتِ جہاں
ہم ہیں اپنے مقام کے وارث

بزمِ جمشید اب کہاں شاہد
ہم ہیں اب دورِ جام کے وارث

ج
چ
ح
خ



○

نالوں کے قدم لیتا ہے بڑھ بڑھ کے اثر آج
اُن کا ہے مگر حکم کہ فریاد نہ کر آج

یہ طرزِ بیاں نُطق پہ موقوف نہیں ہے
ہم محوِ تکلّم ہیں بہ اندازِ نظر آج

اللہ رے وارفتگیِ شوق کا عالم
وہ سامنے ہیں اور نہیں اپنی خبر آج

اِس دورِ پُر آشوب سے اللہ بچائے
اِنسان کا معیار نہیں علم و ہُنر آج

ہے دُور بہت حلقۂ چشمِ نگراں سے
نظارگیٔ مطلعِ انوارِ سحر آج

ادراک ہے گمراہ تو احساس ہے مجروح
ہے کارگہِ سُود و زیاں زیر و زبر آج

شاہدؔ سے اب اجمال کی تفصیل نہ پُوچھو
بیگانۂ ادراک ہے نیرنگِ نظر آج

○

زندگی کی جو نئی قدریں ہیں آج
پانے والی ہیں قفس میں بھی رواج

طعنہ زن ہو کیوں جنونِ شوق پہ
ہے یہی غم ہائے دوراں کا علاج

وہ زمانے میں نہ اُبھرے پھر کبھی
جھک گئی جن کی جبینِ احتیاج

وحشتِ دل کے علاوہ دہر میں
عشق کے ہیں اور بھی کچھ کام کاج

چپ ہیں ہم بے کیفیٔ حالات پر
عذرِ مستی ہے نہ شورِ احتجاج

راہ و منزل کے تعین کے لئے
چاہئے فکر و نظر کا امتزاج

شاہدِ گل آ۔ سبو گردش میں لا
وقت کی گردش سے لینا ہے خراج

○

مانوسِ مزاجِ غمِ دل سے جو ہوئی سوچ
پہنائیِ آغوشِ زمانہ میں پلی سوچ

فطرت کے تقاضوں کو نہ سمجھا کوئی جب تک
اندیشۂ حالات کی پابند رہی سوچ

جذبات جہاں آتشِ احساس سے دہکے
لہرا کے وہیں شعر کے سانچے میں ڈھلی سوچ

ناداں ہیں جو بہہ جاتے ہیں جذبات کی رَو میں
ہو وقت کے مقصود میں ہو بات وہی سوچ

اوہام کے طوفاں سے نہ اُبھرے گا زمانہ
محدود اگر سطحِ نظر تک ہی رہی سوچ

تصویر کے خاکے بھی اُبھرنے نہیں پائے
کِس کام کی نقاش تیری نقش گری سوچ

سُلجھا ہُوا پیرایۂ اظہار ہے شاہد
آئینۂ مقصد ہے نئی فکر، نئی سوچ

○

جو پاسبانِ شب تھے بنے ترجمانِ صُبح
اس اتفاق میں ہے سراسر زیانِ صُبح

ماحول پر ہنوز مسلّط ہیں ظُلمتیں
محدود ہے ابھی تو اُفق تک جہانِ صُبح

سُوجھی ہے کیوں نسیمِ سحر دل لگی تجھے
ہم کو نہ چھیڑ ہم تو ہیں تہمت کشانِ صُبح

ساقی کہیں ہے، رند کہیں، ساتگیں کہیں
یہ شرحِ بزمِ دوش ہے یا داستانِ صبح

آخر گرانیٔ شبِ غم کام کر گئی
روشن پلک پلک پہ ہوئے ہیں نشانِ صبح

جز پرتوِ فریبِ نظر اور کچھ نہیں
جس روشنی پہ ہم کو ہوا ہے گمانِ صبح

راہوں پہ شب گزیدہ اُجالے محیط ہیں
شاید بھٹک نہ جائے کہیں کاروانِ صبح

○

انتظار اور ابھی شوقِ فراواں کی طرح
وا ہے آغوشِ طلب دیدۂ حیراں کی طرح

رشتۂ ضبط بھی نازک ہے رگِ جاں کی طرح
دل کہیں ٹوٹ نہ جائے ترے پیماں کی طرح

آئینہ دیکھنے والے نے مجھے دیکھا ہوتا
میں بھی آشفتہ ہوں اب زلفِ پریشاں کی طرح

راہ و منزل کا احاطہ نہ کرے اے ذوقِ نظر
ان مراحل سے گزر موجۂ طوفاں کی طرح

ہم نے اب زاویۂ فکر بدل کر شاہد
کنجِ زنداں کو سجانا ہے گلستاں کی طرح

○

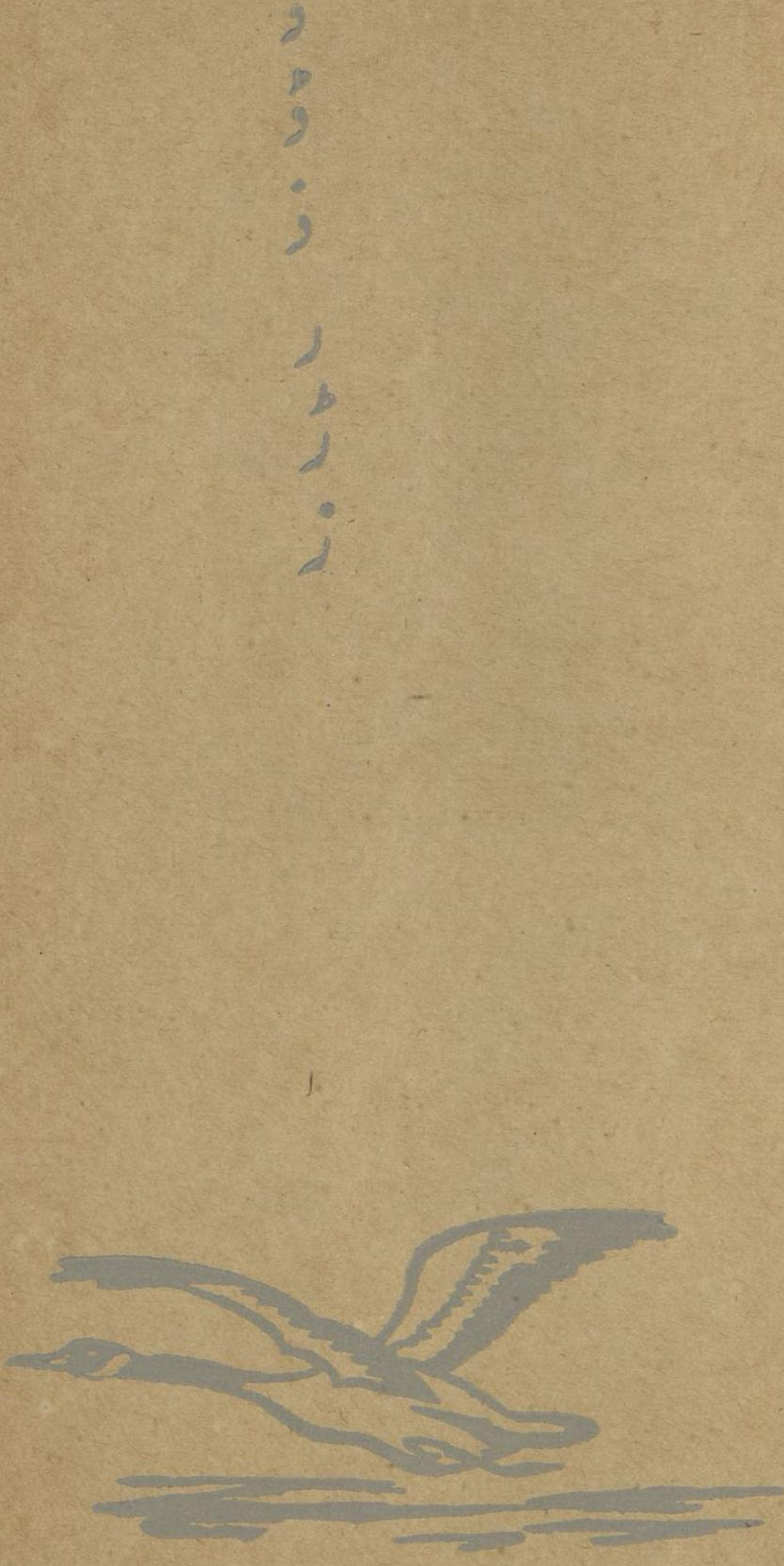
فرشِ سبزہ و آبِ سُرخ سُرخ
صحنِ گُل ہو اور شرابِ سُرخ سُرخ

آشیاں جلے چمن اُجڑ گئے
ہے یہ شرحِ انقلابِ سُرخ سُرخ

ہم بُھلا رہے ہیں داستاں مگر
یاد رہ نہ جائے بابِ سُرخ سُرخ

اب تو ظُلمتِ شبِ حیات سے
ہو طُلوع آفتابِ سُرخ سُرخ

شاہدِ حیات چھیڑ وہ غزل
دے جو درسِ انقلابِ سُرخ سُرخ



○

منظر پرست سب ہیں نہیں کوئی ہوشمند
ہر پھول کے لبوں کا تبسم ہے زہرخند

چاہے جو رنگ اے غمِ دل اختیار کر
ہے دل کی دھڑکنوں کو تری ہر ادا پسند

تہمت کشانِ ہوش کی غیرت کو کیا ہوا
توبہ کا در ہو باز درِ میکدہ ہو بند

آباد ہو گئی ہیں وہیں تازہ بستیاں
جس راہ سے بھی گزرے ہیں آشفتہ حال چند

اُس روشنی پہ کون گمانِ سحر کرے
جس روشنی سے رات کے سائے ہوں بہرہ مند

بیدار ہو تو خاک کا ہر ذرۂ رواں
پھینکے مہ و ستارہ و خورشید پر کمند

شاہد اگر تجھے ہوسِ بال و پر نہ ہو
حدِ نظر سے بھی تری پرواز ہو بلند

غمِ حیات ملا مژدۂ حیات کے بعد
کچھ اور چاہئے اس طرزِ التفات کے بعد

خود اعتمادیِ دل کو شکست دے نہ سکی
تمھاری یاد بھی ترکِ تعلقات کے بعد

نہ ذکرِ جادہ و منزل نہ اب صدائے جرس
بڑا سکوت ہے سیلِ تغیرات کے بعد

عجب نہیں کہ مرے دل کو راس آجائے
تِرا ستم بھی ترے حُسنِ التفات کے بعد

وجودِ ظلمتِ ماحول کو مٹا نہ سکی
نمودِ صبح کی پہلی کرن بھی رات کے بعد

نیا نظام دیا وقت نے زمانے کو
جنونِ شوق کی ہر تازہ واردات کے بعد

یہ گردشیں تو ہیں اجزائے زندگی شاہدؔ
حیات اور نکھرتی ہے حادثات کے بعد

○

تصوّر میں رہی اب تک جو آباد
کہاں ہے وہ بہارِ گلشن ایجاد

نہ منزل ہے نہ گردِ راہِ منزل
پڑی ہے قافلوں پر کیسی اُفتاد

کریں اب اور کیا شرحِ تمنّا
شبِ غم بن گئی ہے صبحِ بیداد

وہاں حکمِ زباں بندی عبث ہے
جہاں ہر سانس ہو مجبورِ فریاد

ہم اپنے دام میں خود آ گئے ہیں
نہیں اب احتیاجِ دستِ صیّاد

اگر نازک ہے رشتہ دوستی کا
تو نازک تر ہے ضبطِ غم کی بنیاد

سُنا ایسا کوئی پیغام شاہد
غمِ حالات سے کر دے جو آزاد

—

○

موسم یہ ہے نہ پیرِ خرابات پر گھمنڈ
اب دورِ جام کو ہے مِری ذات پر گھمنڈ

آشوبِ دہر باعثِ تکمیلِ دہر ہے
ہر دور کو ہے گردشِ حالات پر گھمنڈ

اوہامِ نام و ننگ سے ہے بے نیازِ عشق
کرتے ہیں بوالہوس نسب و ذات پر گھمنڈ

وابستۂ طلب ہے مری تشنگی، مجھے
اب نازِ ابر پر ہے نہ برسات پر گھمنڈ

دل کو ہے شکوۂ غلط اندازیِ نگاہ
ذوقِ نگاہ کو ہے اسی بات پر گھمنڈ

نازاں ہیں وضعداریِ ذوقِ جنوں پہ ہم
ہم کو نہیں خرد کی روایات پر گھمنڈ

ادراکِ غم ہے پرتوِ احساس و آگہی
شاہد مجھے ہے شدتِ جذبات پر گھمنڈ

○

عروسِ فکر ہے زینت دہِ کاشانہ کاغذ
حسین و سادہ و دلچسپ ہے افسانۂ کاغذ

ہے محوِ غمِ جاناں کہ ہو وقفِ غمِ دوراں
دھڑکتا ہے بہر صورت دلِ دیوانۂ کاغذ

پئے ہر تشنہ کامِ شوق اب بے منّتِ ساقی
کہ لبریزِ مئے احساس ہے پیمانۂ کاغذ

کیا خود اس کو روشن تندیٔ بادِ مخالف نے
جدھر دیکھو فروزاں ہے چراغِ خانۂ کاغذ

تری آنکھوں کی وہ تصویر کھینچی میں نے لفظوں میں
کہ تو خود بھی ہوا گرویدۂ مستانۂ کاغذ

حدیثِ وقت کا پیرایۂ خاموش ہے شاہد
طلسمِ دہر ہے دراصل حیرت خانۂ کاغذ

○

دیکھنے والے ذرا حدِّ نظر سے تو گذر
کہکشاں کے اُس طرف بھی ہیں مقاماتِ نظر

صرف تنہا میں ہی لذّتِ آشنائے غم نہیں
اِک ہنسی کی دُھن میں ہے سارا جہاں باچشمِ تر

اب بھی ہے محتاج ہر منزل چراغِ راہ کی
یہ ستارے تو نہیں کچھ بھی بجز گردِ سفر

صبحِ نو سے تو حسیں تھا صبحِ نو کا انتظار
کیا خبر تھی ٹوٹ جائیں گے طلسماتِ نظر

جو خزاں میں فرصتِ پرواز سے محروم تھے
وہ عنادل موسمِ گل میں ہوئے بے بال و پر

یہ مری پہچان ہے شاہد کہ ہے سب کے لئے
ہر نفس پیغام میرا، ہر نظر پیغام بر

—

○

وسعتِ کائنات ہے مسحور
ہو رہا ہے نظامِ نو کا ظہور

زندگی ساز، زندگی ناساز
اب کسے یہ تضاد ہے منظور

تُم روایات کے غلام رہو
ہم تراشیں گے اک نیا دستور

پھر اُجاگر ہے سطحِ مشرق پر
ارتقائے حیات کا منشور

صُبحِ دیر و حرم ہے تیرہ و تار
شامِ فکرِ جدید نُور ہی نور

○

نہ بوئے گل میں کشش ہے نہ روئے گل پہ نکھار
یہ کس مقام پہ ٹھہرا ہے کاروانِ بہار

کوئی تو منزلِ گم گشتہ کی خبر لائے
قدم قدم پہ ہیں قحطِ حیات کے آثار

غمِ حیات سے مانوس کر دیا دل کو
غمِ حبیب کی اس دلنشیں ادا کے نثار

دلیلِ حسنِ سفر ہے یہی کہ ہو جائے
سپردِ بادِ مخالف، چراغِ راہگزار

وہ غم ہی کیا جو نہ ٹھہرے مزاجِ دل شاہد
وہ دل ہی کیا جو نہ ہو وقفِ لذتِ آزار

○

ہٹو ہٹو پردۂ نظر سے جمال دکھلاؤ دُور جا کر
مری نگاہوں کو فاصلہ دو چُھپے ہوئے ہو قریب آ کر

حسین تاروں کی انجمن کو سحر سے پہلے کرو نہ برہم
یہیں ٹھہر جاؤ رات آدھی گذر چکی کیا کرو گے جا کر

یہ کس کے قدموں کی چاپ سینے میں دھڑکنیں بن کے آ رہی ہے
یہ کون سوئی ہوئی جوانی کو گدگداتا ہے گُنگُنا کر

تبسم افشاں ہوئے ستاروں کے پھول لہرا گئے اجالے
یہ کون جھانکا گھنیری پلکوں کی سرمئی چلمنیں اٹھا کر

گراں ہے فکر و نظر پہ شاہدِ حیات کے شعبدوں کا افسوں
کوئی سلا دے تھکی ہوئی کائنات کو لوریاں سنا کر

○

منزل کا تعیّن کیا معنی منزل ہے زوالِ فکر و نظر
ہر سلسلۂ دوراں سے نکل، ہر مرحلۂ امکاں سے گزر

کیا تو نے سُنی ہیں گیتوں میں فریادوں کی جھنکاریں بھی
بپھرے طوفانوں میں جلتے دیکھے ہیں چراغِ راہگذر؟

آرائشِ آب و گِل میں اگر نوخیز زمانہ محو رہا
حالات دکھائیں گے ہم کو کچھ اور بھیانک سے منظر

جب اکھڑے ہوئے انفاس کی لَو ماحول کا دامن چھولے گی
انسانوں کے دستوروں پہ ہنس دے گا نظامِ شام و سحر

مچلے ہوئے احساسات نے جب افکار کی نبضوں کو چھیڑا
بدلے ہوئے رجحانات ملے ہر موڑ پہ ہر دور لہے پر

بیباک سفینوں کی شاھد ہر موج نگہباں ہوتی ہے
جذبات کی تحریکوں سے اُلجھ، حالات کے طوفانوں میں اُبھر

○

فکرِ غمِ حیات کر ذکرِ غمِ نہاں نہ چھیڑ
وقت کی داستاں سُنا، قصۂ رائیگاں نہ چھیڑ

گردشِ وقت ہے اِدھر گردشِ جام ہے اُدھر
زخمۂ دل ذرا ٹھہر سازِ غمِ جہاں نہ چھیڑ

کوند رہی ہیں بجلیاں بر سرِ شاخِ آشیاں
فصلِ بہار ہے کہاں، اے غمِ گلستاں نہ چھیڑ

کٹ گئی شامِ غم تو کیا صبحِ طرب سے فائدہ
راہ لگ اپنی اے صبا بیٹھے ہیں سرگراں، نہ چھیڑ

حُسن اگر ہے بے بساط، عشق ہے رُو بہ انحطاط
جذبۂ شوق احتیاط، نغمۂ عاشقاں نہ چھیڑ

آج کہاں وہ مستیاں اور وفا پرستیاں
لُٹ گئیں ساری بستیاں اب کوئی داستاں نہ چھیڑ

ذوقِ جنوں ہے مشتعل، ضبط ہے غیر مستقل،
سلسلۂ حدیثِ دِل شاہدِ خوش بیاں نہ چھیڑ

○

لے کے مہر و ماہ و انجم کی جہاں افروز آڑ
روشنی برسا رہے ہیں تیری پلکوں کے کواڑ

یہ سماں ہے خود ہی شرحِ داستانِ عہدِ نو
راستے سنسان، سونی محفلیں، گلیاں اُجاڑ

اب یہی تو جوہرِ آئینۂ ادراک ہے
دامنِ احساس سے گردِ غمِ دوراں نہ جھاڑ

واردات زندگی کا راز بن کر رہ گئی
میرے دل کی دھڑکنوں سے تیرے غم کی چھیڑ چھاڑ

زندگی شاہد ہے وقفِ اتفاقاتِ جہاں
لاکھ طوفاں، اک تعطّل، سو بناؤ اک بگاڑ

—

○

اور بھی رقصِ جام و ساغر تیز
چاہیئے رخشِ عمر کو مہمیز

میں ہوں اور اُن کی یاد کا عالم
آج ہر نقشِ غم ہے دلآویز

عشق میں ہیں وجوہِ ناکامی
ہوس و حیلہ و فرار و گریز

بن گیا دل چھلک کے پیمانہ
بادۂ غم سے جب ہوا لبریز

احتیاط اے شعورِ بیداری
وقت ہے پختہ کار تُو نوخیز

اب وہ اربابِ غم کہاں ساقی
ہر ادا جن کی ہو طرب انگیز

مسندِ اختیار پر شاہد
کوئی فرعون ہے کوئی چنگیز

—

○

ہے وقت کا یہ ادنےٰ سا اعجاز
بدلے ہوئے ہیں جینے کے انداز

ایسے بھی ہیں کچھ نغمے جہاں میں
اب تک نہیں جو شرمندۂ ساز

وہ سب عنادلِ بے بال و پر ہیں
صحنِ چمن تک ہے جن کی پرواز

اور اک آدم اک اور لغزش
جبرِ مشیت اک اور اعجاز

دنیا پہ ہوں گے اب آشکارا
سینہ بہ سینہ آئے ہیں جو راز

پھر نرم و نازک احساس بن کر
دل میں بسا ہے اک پیکرِ ناز

راہِ طلب میں ہوتا ہے شاہدؔ
آغاز انجام، انجام آغاز

—

س
ش
ص
ض
ط
ظ



○

بن رہے ہیں نشیمن قفس در قفس
ہے بڑی دُور تک عشق کی دسترس

اب تو کُھل کھیل اے احتیاطِ جنوں
اب نہیں کوئی گنجائشِ پیش و پس

آرزو کیا ہے جز حسرتِ زندگی
زندگی کیا ہے جُز فرصتِ یک نفس

داستانِ غمِ دل سنائیں کسے
اب کوئی داورس ہے نہ فریادرس

ہے مری کشتِ اُمید ویراں ابھی
چشمِ خونبار کچھ اور کھل کر برس

جانے گذری ہے کیا منزلِ شوق پر
کارواں ہے نہ کوئی صدائے جرس

وضعِ نازو نیاز آج شاہد کہاں
حُسن ہے خودنُما، عشق ہے بُوالہوس

○

اہلِ ظاہر اس حقیقت سے نہیں ہیں روشناس
عالمِ ادراک ہے حدِّ نظر کے آس پاس

اب یہاں بھی راستہ روکے کھڑی ہیں گردشیں
لِسبتاً ہم کو ہوا ئے میکدہ آئی تھی راس

یہ مراعاتِ سفر ہیں یا روایاتِ جنوں
ہر قدم ہے جادہ پیما ہر نظر منزل شناس

سرخوشی اور شدّتِ غم میں ہے ربطِ باہمی
جوہرِ آئینۂ شبنم ہے پھولوں کی اساس

وہ ستارے پڑ گئے کیوں ماند ہنگامِ سحر
کھو گئے تھے جن کے جلووں سے مرے ہوش و حواس

طبعِ ہستی پر گراں پھر کیوں نہ ہو اُن کا وجود
زندگی جن کی ہے شاہد خوگرِ حرفِ سپاس

—

○

شعورِ زندگی ہے مصلحت کوش
نہ ساقی ہے نہ رندانِ بلا نوش

وہ آئے سامنے یُوں زُلف بر دوش
نظر خود بن گئی صہبائے سرجوش

سلامت اے فریبِ وعدۂ وصل
بسانِ چشمِ نرگس وا ہے آغوش

نگاہِ شوق خود حیرت فزا ہے
نہیں ورنہ کوئی غارت گرِ ہوش

ہمیں ادراکِ غم بھی ہے مگر ہم
بپاسِ مصلحت رہتے ہیں خاموش

چمن میں اہتمامِ فصلِ گُل ہے
مبارک اے جنونِ خانہ بر دوش

یہ تاویلیں ہیں سب افتادگی کی
غمِ فردا ہو تا حدِ غمِ دوش

○

پھر ہے دل کو لذتِ غم ہائے پنہاں کی تلاش
پھر ہے آنکھوں کو کسی خوابِ پریشاں کی تلاش

وہ سکوں ناآشنائے حلقۂ ساحل رہے
جن سفینوں کو نہ تھی آغوشِ طوفاں کی تلاش

تندیٔ بادِ مخالف نے جنھیں روشن کیا
اُن چراغوں کو بھی اب ہے کنجِ داماں کی تلاش

زندگی شہروں میں بھی وحشت اثر ہے آج کل
کیوں کریں اہلِ جنوں دشت و بیاباں کی تلاش

زندگی پابندِ غم ہو کر بھی بے مصرف نہیں
جو ہیں اہلِ درد کب کرتے ہیں درماں کی تلاش

اہلِ گلشن کے لیے جو مطلعِ انوار ہو
فصلِ گُل کو اب ہے اُس چاکِ گریباں کی تلاش

برقِ شاہد گوشہ گیرِ دامنِ گُل ہو جہاں
اُن خرابوں میں نہ کر دورِ بہاراں کی تلاش

○

بجلیوں کا رقص اچھا ہے نہ طوفانوں کا رقص
حشر در آغوش ہے لیکن جہانبانوں کا رقص

فطرتِ آدم پہ ہے جبرِ مشیت خندہ زن
دیکھ انسانوں کی مجبوری پہ انسانوں کا رقص

دیکھئے کیا گل کھلاتی ہے بہارِ جانستاں
برق ساماں ہے گلستاں کے نگہبانوں کا رقص

آ گئے خود ہی سفینے حلقۂ گرداب میں
دیکھ کر خاموشیاں ساحل کی، طوفانوں کا رقص

یہ سماں غمّاز ہے تبدیلئ حالات کا
دیدنی ہے سوچ فرزانوں کی، دیوانوں کا رقص

گردشِ دوراں پہ اک رنگین و دلکش طنز ہے
شوق رندوں کا، ادا ساقی کی، پیمانوں کا رقص

عشق ہے شاہد نقیبِ سوز و سازِ زندگی
زندگی کیا ہے حضورِ شمع پروانوں کا رقص

—

○

بھری بزم میں کون ہے بے غرض
غرض مند ہیں سب بِرُوئے غرض

زمانے سے محتاط رہنا کہیں
محبّت کو رسوا نہ کردے غرض

مٹے کیوں نہ رسمِ وفا دہر سے
صِلہ جب وفا دل کا ٹھہرے غرض

بپاس تقاضائے اہل کرم
کبھی ہم بھی ڈالیں گے خوئے غرض

پلا جام، صہبا ہے یا زہر ہے
بلا نوش رندوں کو اس سے غرض

تری بزم میں کارفرما ہے آج
خلوص و مروّت کے بدلے غرض

وہی لوگ ہیں نازشِ زندگی
جو شاہد ہیں اس دور میں بے غرض

—

○

حسنِ جذبات گیسو و عارض
رُوحِ نغمات گیسو و عارض

میری آنکھوں پہ چھائے رہتے ہیں
اب تو دن رات گیسو و عارض

سایۂ ابر و جلوۂ گُل کو
دے گئے مات گیسو و عارض

سربسر کائنات کی تفسیر
نور و ظلمات گیسو و عارض

شرحِ مستی ہے پیکرِ جاناں
اقتباساتِ گیسو و عارض

یوسفِ روز و لیلیٔ شب کی
وجہِ اثباتِ گیسو و عارض

چھا گئے بزمِ ہوش سے شاھد
تا خرابات گیسو و عارض

○

آئینِ غم ہے روکشِ آئینۂ نشاط
اللہ رے یہ عالمِ نیرنگِ ارتباط

وہ جوشِ آرزو وہ خروشِ وفا کہاں
عشقِ جنوں سرشت ہے مائل بہ انحطاط

محسوس ہو رہا ہے چمن بھی قفس مجھے
زندانِ گیر و دار ہے ہر گوشۂ بساط

ذوقِ طلب ہے جرأتِ قلب و نظر کا نام
ہے کارواں کو ننگِ سفر رسمِ احتیاط

ناحد نکل کے حلقۂ پیرِ مغاں سے ہم
پھرتے ہیں شش جہت میں عبث بہرِ انبساط

○

آدمی اور آدمی کا لحاظ!
کون کرتا ہے اب کسی کا لحاظ

عشق اور پاسِ وضعداریِ غم
حسن اور نازِ دلبری کا لحاظ

دوست، اکثر رہا مرے دل میں
تیری در پردہ دشمنی کا لحاظ

کیا توقع کرے کسی سے کوئی
اب کہاں فرضِ منصبی کا لحاظ

ابر و برسات و موسمِ گُل میں
کچھ تو کر میری تشنگی کا لحاظ

گردشوں نے روا نہیں رکھا
زندگی میں کبھی کسی کا لحاظ

وقت سے بھی نہ ہو سکا شاہدؔ
شدتِ غم میں سرخوشی کا لحاظ

ع
غ
ف
ق
ک
گ



○

نئے نئے ہیں مسائل نئے نئے موضوع
بہ فیضِ وقت نیا دور ہو چکا ہے شروع

گہن کے روگ سے آزاد ہے نمو اُس کی
جو آفتاب ہُوا ہے نئے اُفق پہ طلوع

پناہ گر نہ ملی گردشِ جہاں سے تو ہم
نگاہِ پیرِ خرابات سے کریں گے رجُوع

صلاحِ عقل سے ہے بے نیاز جذبۂ دل
کہ شرعِ عشق میں ہے کارِ مصلحت ممنوع

مجیدؔ خاک نشینوں کا احترام کرو
کہ آسماں بھی تو پیشِ زمیں ہے محوِ رکوع

—

○

جدّتِ افکار ہے اور اہلِ فن کا اجماع
اب تو اجمالاً بھی ہے متروک رسمِ اتّباع

ظلمتِ ماحول کے حق میں ہے پیغامِ اجل
آفتابِ فکرِ نو کی ایک ہلکی سی شعاع

خود ہی منزل، خود ہی رہزن خود ہی میرِ کارواں
قافلے والے ہیں گویا آپ ہی اپنی متاع

اب اشاروں میں بھی ہیں جذب اثر کی وسعتیں
اللہ اللہ فکرِ انساں کی یہ نازک اختراع

مشترک اقدار کے حامل ہیں اب عقل و جنوں
دیدہ و دل میں نہیں باقی کوئی وجہِ نزاع

آنکھ بھر آئی جہاں، تسکینِ خاطر ہو گئی
وارداتِ غم ہے شاہد سرخوشی کی اطلاع

○

جب بھی دھرتی نے جلائے ہیں چراغ
ماہ و انجم کو دکھائے ہیں چراغ

اُن کی ضو سے تو اندھیرے ہی بھلے
مانگ کر آپ جو لائے ہیں چراغ

عارضی ہے یہ اُجالوں کا سماں
رات لمبی ہے پرائے ہیں چراغ

وقت کی تیز روی نے اب تک
ایسے کتنے ہی بجھائے ہیں چراغ

آتشِ فکر کی لَو سے ہم نے
طاقِ زنداں میں جلائے ہیں چراغ

پردۂ ظلمتِ شب پر شاہد
رقص کرتے ہوئے سائے ہیں چراغ

○

جس چمن میں لالہ و گُل کے جگر ہوں داغ داغ
اُس چمن میں سیرِ صبحِ گُل کا ہو کس کو دماغ

روکشِ مہرِ درخشاں ہیں مرے سینے کے داغ
ظلمتِ ماحول میں گویا فروزاں ہیں چراغ

زندگی ہمواریٔ رفتار کی قائل نہیں
دیکھیے یکرنگیٔ حالات سے کب ہو فراغ

ظلمتیں ہر سو غمِ دوراں کی ہیں چھائی ہوئی
دُور تک ملتا نہیں اہلِ محبّت کا سُراغ

جب فضاؤں میں چھلک جاتی ہیں رنگیں بدلیاں
ناچ اٹھتی ہے صُراحی جھوم اُٹھتے ہیں ایاغ

دل کی کیفیات پر موقوف ہے حُسنِ طلب
پرتوِ ذوقِ نظر ہیں کوہ و دشت و باغ و راغ

حادثے دیتے ہیں شاہد درسِ فکر و آگہی
آندھیوں میں بھی بسا اوقات جلتے ہیں چراغ

—

○

سوئے میخانہ چلے جب صف بہ صف
جھوم کر جام آئے رندوں کی طرف

قطرۂ مے گوہرِ نایاب ہے
اور پیمانہ ہے آغوشِ صدف

ق

جب کبھی ساقی نے دیکھا وقت کو
میکدہ بر دوش و پیمانہ بکف

کرکے موسم کے تقاضوں کا لحاظ
ہم کو بخشا باریابی کا شرف

سنگِ خارا کو بھی نازک جام سے
رند مستی میں بناتے ہیں ہدف

میکشو، حالات کا رُخ پھیر دو
کہکشاں کی سمت، پھولوں کی طرف

میکدے کے راستے کی دھول ہے
سیج پھولوں کی ہو یا تاروں کی صف

ہم بہ ایمائے طلب پہنچے کہاں
روشنی ہی روشنی ہے ہر طرف

بن گئے شاھد اب اجزائے حیات
ساغر و مے، بربط و نے، چنگ و دف

—

○

غیر سے ربط، شکایات کا رُخ میری طرف
کاش ہو تیری ہر اک بات کا رخ میری طرف

زندگی جہدِ مسلسل کے سوا کچھ بھی نہیں
پھیر دے گردشِ حالات کا رُخ میری طرف

جانے کیا بات ہے کیوں آج تری محفل میں
ہے رقیبوں کے اشارات کا رُخ میری طرف

ابر ہو فصلِ بہاراں ہو تو پھر جاتا ہے
خود بخود قبلۂ حاجات کا رُخ میری طرف

دوست، نیرنگیِ ایّام کے با وصف رہا
دِن کا رُخ تیری طرف، رات کا رُخ میری طرف

سایۂ زُلف میسّر ہے نہ پیمانہ نہ گُل
ابر کا رُخ ہے نہ برسات کا رُخ میری طرف

کٹ گئی عمر خرابات میں لیکن شاہد
نہ ہوا پیرِ خرابات کا رُخ میری طرف

○

حالات کی روش پہ نہیں انحصارِ شوق
وابستۂ حیات ہیں سب کاروبارِ شوق

کیا کیا ستم نہ ڈھائے غمِ روزگار نے
پھر بھی نہ ٹوٹنا تھا نہ ٹوٹا خمارِ شوق

اے دوست، حادثاتِ مسلسل کے باوجود
ہم لوگ جی رہے ہیں بصد اعتبارِ شوق

یا رب ہو خیر جذبہ بے اختیار کی
حائل ہے آج راہِ طلب میں غبارِ شوق

ذوقِ جنوں نواز نے آسان کر دیئے
جو سخت مرحلے تھے سرِ رہگذارِ شوق

کوئی بھی فاصلوں کا تعیّن نہ کر سکا
ہے دل کے آس پاس ہی ورنہ دیارِ شوق

لایا ہے کس مقام پہ جذبِ رواں مجھے
شاہد نظر نظر ہے اب آئینہ دارِ شوق

○

سکوں کہاں کہ زلیست پر نہیں ہے اختیار تک
یقیں نہیں کہ جی سکے کوئی مآلِ کار تک

گلوں کا رقص، مستیِ صبا، خرامِ رنگ و بُو
یہ سلسلے مری نظر سے ہیں ترے دیار تک

شعورِ عام ہو اگر تو ہے ذرا سا فاصلہ
غمِ غریبِ شہر سے غرورِ شہر یار تک

اصول ایک ہے مگر جدا جدا ہیں ضابطے
جہانِ مہر و ماہ سے چراغِ رہگذار تک

عجب نہیں کہ ہنس کے وہ یہ مرحلے بھی طے کریں
تلاشِ عہدِ گل میں جو پہنچ گئے ہیں دار تک

جو پی کے کھو گئے کسی کے گیسوؤں کی چھاؤں میں
نہ آسکا پھر اُن کو ہوش آمدِ بہار تک

وفائے عہدِ شرعِ عشق میں ہے مرگِ آرزو
کہ اضطرابِ شوق ہے فریبِ انتظار تک

—

راہ دشوار ہے فضا تاریک
کوئی منزل ہے غالباً نزدیک

رشتۂ فکر پائیدار تو ہے
لاکھ تارِ نگہ سے ہو باریک

جو گرفتِ نظر میں آ نہ سکے
وہ اجالے ہیں ذہن کے نزدیک

آگ لگ جائے اُس گلستاں کو
جس کے دامن میں ہو بہار کی بھیک

آنسوؤں کے دیئے جلائے گئے
صبح نو تھی کچھ اس قدر تاریک

ہر حقیقت پہ ہے گمانِ فریب
توبہ توبہ یہ عالمِ تشکیک

جس کا مقصد ہو ارتقائے حیات
زندہ رہتی ہے ایسی ہر تحریک

کیوں نہ آئے نکھار گلشن پر
خونِ شاہد ہے رنگِ گل میں شریک

○

لاکھ جتن کر کر تم ہارے پھر بھی ہار نہ مانے لوگ
قریہ قریہ بستی بستی پھیل گئے دیوانے لوگ

آپ سے ہم کو کیا نسبت ہے آپ نہ رکھیں ہم سے بیر
ہم ہیں سادہ لوح فقیر اور ٹھہرے آپ سیانے لوگ

اُکتا کر حالات کی گردش سے سلجھانے آتے ہیں
میخانے میں اُلجھی ہوئی سانسوں کے تانے بانے لوگ

اپنوں سے کیا پایا ہم نے غیروں سے کیوں میل بڑھائیں
مطلب کے سب ساتھی ہیں کیا اپنے کیا بیگانے لوگ

ہم جس حال میں ہیں سو اچھے ہیں تم اپنی راہ لگو
لوگو ہم سے چھیڑ نہیں اچھی ہم ہیں دیوانے لوگ

تیری بے مہری کے ہاتھوں ساقی اک دن محفل میں
ٹکرا دیں گے خُم سے خُم پیمانوں سے پیمانے لوگ

راہِ طلب میں آج فقط شاہدؔ ہی تنہا گرد نہیں
اب اس رستے میں ہیں بہتیرے جانے پہچانے لوگ

○

رو میں ہے سیلِ اشک سُلگتی ہے من میں آگ
برسات ہو تو جلتی ہے ہر انجمن میں آگ

خوش فہمیٔ نگاہ کو جھُلسا نہ دے کہیں
اے صبحِ نو چھُپی ہے تری ہر کرن میں آگ

لوگوں نے مُفت نام دھرا برق و باد پر
خود ہم نے آشیاں کو دکھائی چمن میں آگ

ہر برگِ گُل نے بڑھ کے ہوا دی ہے دوستو
سُلگی ہے جب بھی حلقۂ سرو و سمن میں آگ

وہ سب چراغ ہیں شبِ غم کے جلے ہوئے
جن سے لگی ہے دامنِ صبحِ وطن میں آگ

جل بجھ کے راکھ ہو گئی جب شاخِ آشیاں
پہنچی نکل کے باغ سے بستی میں بن میں آگ

ہم دل جلوں سے کیوں ہے نسیمِ سحر کو بیر
شاید بھڑک اٹھے نہ کہیں دم زدن میں آگ

ل
م
ن



○

موجِ صبا ہے اب بھی ادا ناشناسِ گُل
ورنہ ہے بُوئے گل سے بھی نازک اساسِ گُل

آرائشِ بہار ہے زخمِ خزاں نہیں
سامانِ یاسِ بُلبل و وجہِ ہراسِ گُل

یارب طلوعِ صبحِ بہاراں کی خیر ہو
برقِ بلا ہے زمزمہ سنجِ سپاسِ گُل

راہِ طلب میں آبلہ پائی کے باوجود
کانٹوں کے ناز ہم نے اٹھائے بپاسِ گُل

ہے ذرّہ ذرّہ خاکِ چمن کا چمن فروش
یہ رسمِ باغباں بھی بعید از قیاسِ گُل

کب تک خزاں سرشت بہاروں کی چھاؤں میں
قائم رہے گا سلسلۂ اقتباسِ گُل

یہ حادثہ ہے یا روشِ انقلاب ہے
نوکِ زبانِ خار پہ ہے التماسِ گُل

شاہد اب احتیاجِ جنوں بھی نہیں رہی
از فرق تا قدم ہے گریباں لباسِ گُل

—

○

جلا کر برق نے کاشانۂ گُل
کیا خود مشتہر افسانۂ گُل

گھٹا لائی بنامِ مے پرستاں
پیامِ ساقیِ میخانۂ گُل

سبو چھلکاؤ پیمانے اُچھالو
یہی ہے مشربِ رندانۂ گُل

بہک جائیں فضاؤں میں ستارے
چھلک جائے اگر پیمانۂ گل

حوادث، بجلیاں، صیّاد، گلچیں
اور اس پر خندۂ مستانۂ گل

رہے قائم جنوں کی وضعداری
مچل جا اے دلِ دیوانۂ گل

سرشکِ دیدۂ انجم سے شاہد
فروزاں ہے چراغِ خانۂ گل

—

○

سکھا کے فکر و نظر کو تمیزِ ماضی و حال
بچھا دیا ہے خرد نے تعینات کا جال

ذہانتوں پہ گراں ہے تصوّرِ پہ وبال
یہی گریز ہے در اصل قوّتوں کا زوال

کوئی سمجھ نہ سکا رمزِ آگہی، ورنہ
بڑی حسین ہے عروسِ غمِ حیات کی چال

یہ سنگ و خشت کی دُنیا عجیب دُنیا ہے
کہیں حقیقتِ عریاں کہیں فریبِ خیال

مشاہدات ہیں فرزانگی کا ذکر نہ چھیڑ
کہ ارتقائے نظر ہے بقیدِ ہوش محال

یہ آگہی کہ ہے اندازِ آگہی بھی فریب
یہ زندگی کہ ہے احساسِ زندگی بھی وبال

خیالِ دُورِیِ منزل نہ حیلۂ منزل
ہر ایک پھر بھی ہے گرمِ سفر بقدرِ مجال

ہوئے طلوع ہزار آفتابِ تازہ مگر
نہاں ہے پھر بھی دُھندلکوں میں صبحِ نو کا جلال

ہوں منتظر کہ زمانہ جواب دے شاھد
زبانِ حال پہ اُبھرے ہیں کچھ عجیب سوال

○

زہے کیفیّتِ حُسنِ غمِ دل
ستارے ہیں مرے اشکوں کا حاصل

رہے منجدھار میں جب تک سفینے
بذاتِ خود بنی ہر موج ساحل

جہاں ذوقِ طلب خود رہنما ہو
وہاں زیرِ قدم ہوتی ہے منزل

مئے گلرنگ پی کر حل کریں گے
بہت اُلجھے ہوئے ہیں جو مسائل

نظر ساقی نے جب محفل میں بدلی
چھلک کر آبگینے بن گئے دل

مقام اپنا کوئی مخصوص کر لے
چراغِ راہ بن یا شمعِ محفل

کبھی شاہد یہ سنگِ میل ہوں گے
جو پتھر ہیں مرے رستے میں حائل

○

تنہا دل اور اتنے غم
تھم اے گردشِ دوراں تھم

اے میرے انمول آنسو
شعلہ بن جا یا شبنم

ویرانی سی ویرانی
دِل اور دل کا یہ عالم

شاید ڈھلنے کو ہے رات
تاروں کی لو ہے مدھم

اب تو میرے اشکوں میں
آنچ بہت ہے نم ہے کم

راہنماؤ ہٹ جاؤ
راہ نوردو تیز قدم

ان سنگین ایوانوں کی
نازک بنیادیں ہیں ہم

محوِ افکارِ شاہد
اِک دُنیا ہے اک عالم

○

تغیّراتِ نو بنو کے راز پا رہے ہیں ہم
خود اپنی سمت پھر پلٹ پلٹ کے آ رہے ہیں ہم

شکستِ ساز کی صدائے بازگشت سے ڈرو
تھکے ہوئے دلوں کو دھڑکنیں سکھا رہے ہیں ہم

فسادگی نے بڑھ کے جن سے درسِ آگہی لیا
قدم قدم پہ وہ چراغ پھر جلا رہے ہیں ہم

یہ انقلاب آفریں جسارتوں کا فیض ہے
کہ محورِ حیات کے قریب آ رہے ہیں ہم

زمانہ راستہ نہ روک لے ٹھہر، حیاتِ نو
ترے لیے نئے نئے چراغ لا رہے ہیں ہم

روایتوں کی تان توڑ کر بطرزِ آگہی
فرازِ وقت کا پیام گنگنا رہے ہیں ہم

مجیدؔ آگہی پہ منحصر ہیں کامرانیاں
بہت دنوں رہینِ فکرِ ماسوا رہے ہیں ہم

○

گردشِ دوراں گردشِ جام
ایک تسلسل، ایک نظام

ہے یہ دلیلِ حسنِ خرام
پھول کھلے ہیں گام بہ گام

اُن کا تصوّر، اُن کا خیال
حسنِ مجسم، کیفِ تمام

شاید اب منزل ہے قریب
آئے ہیں کچھ سخت مقام

عارض و گیسو کا یہ سماں
صبح گلابی، سانولی شام

جام سے تیری آنکھوں تک
سلسلۂ مستی ہے تمام

شاہد کے نام آتے ہیں
مہر و مہ و انجم کے پیام

○

مانا وقت بڑا نازک ہے غم کھا لیں آنسو پی لیں
چوٹ لگے دل پر تو کیوں کر اُف نہ کریں اور لب سی لیں

ظاہر ہے بے نور اجالوں کی رعنائی کیا ہو گی
مصنوعی ہیں سب مفروضے جھوٹی ہیں سب تاویلیں

ذہنوں کا الجھاؤ کیسا تہمت ہے الزام ہے یہ
چاہو تو حالات کے بہتے دھارے کو ٹھہرا ہی لیں

دیکھیں اب خرمن جلتا ہے یا ماحول بدلتا ہے
تاریکی کی اوٹ میں لہراتی تو ہیں کچھ قندیلیں

ایک نئے مستقبل کی تاریخ مرتب کرنے کو
مشرق میں آزادی کے چڑھتے سورج سے سرخی لیں

جینے کا دستور بہر عنوان بدلنے والا ہے
مرنے والے اس امید پہ جینا چاہیں تو جی لیں

گونج اٹھیں اطراف میں جھنکاریں بیباک تقاضوں کی
آؤ شاھد وقت کی تازہ قدروں کو اپنا ہی لیں

○

پیار کس سے کریں کسے چومیں
ایک عالم بسا ہے پہلو میں

دیر سے تشنہ کام ہیں کانٹے
آؤ دشتِ خیال میں گھومیں

فرق محسوس کر رہے ہیں ہم
اے غمِ زندگی تری خو میں

جائزہ لیجیے گلستاں کا
پھر مچی ہیں بہار کی دھومیں

اُف اُن آنکھوں کی گردشیں جیسے
شوخیِ رم ہو چشمِ آہُو میں

معتکف ہے جوانیِ مستی بھی
گوشۂ چشم و طاقِ ابرُو میں

ہے تقاضائے فصلِ گُل شاہد
پی کے مانندِ شاخِ گُل جھُومیں

○

شوخیٔ پائے طلب مرہونِ آسائش نہیں
حیف وہ رفتار جو آسودۂ لغزش نہیں

انحصارِ گرمیٔ محفل ہے سوزِ اشک پر
آنچ تو ہے ان ستاروں میں اگر تابش نہیں

دم بخود ہے زندگی اندیشۂ حالات سے
کوئی گرمی، کوئی ہنگامہ، کوئی شورش نہیں

اس چمن کا گوشہ گوشہ انقلاب آباد ہے
اس چمن میں مطلقاً ہنسنے کی گنجائش نہیں

آہ وہ ذوقِ نظر جو گم ہے گردِ راہ میں
ہائے وہ جرمِ وفا جس کی کوئی پرسش نہیں

انحصارِ خندۂ گُل گریۂ شبنم پہ ہے
وہ خوشی مہلک ہے جس میں غم کی آمیزش نہیں

اس کے آگے ہیچ ہیں حالات کی حد بندیاں
وقت کا سیلِ رواں شرمندۂ کاوش نہیں

ہو چکی ہے زندگی وابستہ رقصِ جام سے
اب کوئی گردش بھی ہو اندیشۂ گردش نہیں

دہر اک آئینہ خانہ ہی سہی شاہد مگر
کیوں عروسِ زندگی اب محوِ آرائش نہیں

○

گُلوں میں رنگ تو ہے بُوئے انبساط نہیں
یہ دور کیا ہے اگر دَورِ انحطاط نہیں

مری سرشتِ وفا کو ہوس کا نام نہ دے
کہ اس قدر بھی مرا عشقِ بے بساط نہیں

جمالِ دوست سلامت کہ اب تو اس کے سوا
نگاہ و دل میں کوئی وجہِ اختلاط نہیں

تری نگاہ کی شوخی بھی اب تو میرے لیے
جوازِ بے خودی و مستی و نشاط نہیں

یہ میکدہ ہے یہاں ہو سکے تو کھُل کھیلو
کہ اس جہاں میں کوئی شرطِ احتیاط نہیں

○

دِل تباہ کو ہے انتظارِ صبحِ وطن
ہے نامُراد یہ اُمیدوارِ صبحِ وطن

کسی طرح اُفقِ عام پر ہویدا ہو
بہارِ صبحِ وطن اے نگارِ صبحِ وطن

گرانیِ شبِ غم کیا پنپ سکے گی وہاں
نفس نفس ہو جہاں نقش کارِ صبحِ وطن

کوئی ملول نہ ہو بکھرا اں دُھندلکوں سے
یہ عکسِ شام ہے آئینہ دارِ صبحِ وطن

کریں فراہمیِ خار و خس یہ ہی شاہد
کس اعتبار سے ہم اعتبارِ صبحِ وطن

○

آشفتہ سر ہیں بزم میں کچھ لوگ سب کہاں
ملتا ہے منصبِ غمِ دل بے طلب کہاں

تھی دل کے آس پاس کبھی منزلِ مراد
تھا دل پہ اعتبار کبھی لیکن اب کہاں

ہر انجمن میں ہیں غمِ دوراں کے تذکرے
اب ذکرِ چشم و کاکل و رخسار و لب کہاں

ہر منظرِ حیات ہے اک وارداتِ غم
اس بزم میں کسی کو دماغِ طرب کہاں

دیوار و بام و در کی روایات مٹ چکیں
چڑھتی جوانیوں کے حسیں خواب اب کہاں

ہوگا ضرور سلسلۂ جنباں یہاں کوئی
ہوتی ہے ورنہ دل میں خلش بے سبب کہاں

آوارگانِ شہرِ وفا جانے کیا ہوئے
شاہدؔ بجانے کھو گئی راہِ طلب کہاں

○

جدید دام بطرزِ کہن کچھ اور بھی ہیں
ابھی تو عشق کی راہیں کٹھن کچھ اور بھی ہیں

تمہاری چال سے یہ بات آشکارا ہے
کہ حادثاتِ نصیبِ وطن کچھ اور بھی ہیں

کمالِ حسن یہی ہے کہ دل مچل جائے
وگرنہ بزم میں گُلِ پیرہن کچھ اور بھی ہیں

میں دادخواہ نہیں ہوں یہ اتفاق نہیں
مرے مذاقِ طلب کے چلن کچھ اور بھی ہیں

رہِ حیات میں اب رہروانِ منزلِ شوق
نئے چراغ لئے گامزن کچھ اور بھی ہیں

جمالِ دوست مری وضع کا خیال رہے
کہ واقعاتِ سرِ انجمن کچھ اور بھی ہیں

مرے جنوں پہ ہی کچھ منحصر نہیں شاہد
تغیّرات کی دھن میں مگن کچھ اور بھی ہیں

○

نقوشِ طورِ وفا ہیں گواہ کچھ بھی نہیں
تعینات کی حد تک نگاہ کچھ بھی نہیں

متاعِ دردِ محبّت عزیز رکھتے ہیں
وہ مست جن کو غمِ انتباہ کچھ بھی نہیں

خیال و خواب کا محدود راز ہے دُنیا
حیات گاہ بہت کچھ ہے گاہ کچھ بھی نہیں

قدم بڑھا کہ نئی وسعتیں تلاش کریں
جہانِ مختصرِ مہر و ماہ کچھ بھی نہیں

یہ کاش جان سکیں تجھ کو ڈھونڈھنے والے
یقیں بسلسلۂ اشتباہ کچھ بھی نہیں

مجید دیر و حرم کے چراغ گُل کر دو
یہ منزلیں تو بجز گردِ راہ کچھ بھی نہیں

—

○

کہیں گمانِ فریب اور کہیں فریبِ گماں
حیات اب بھی ہے مبنی بر اتفاقِ جہاں

مری نظر کے تقاضوں کا اضطراب اے دوست
ترے ہی جلوۂ بے اختیار سے ہے عیاں

یہ غم نہیں کہ وہ مائل بہ دوستی نہ ہوئے
ملال یہ ہے کہ لایا دلِ خراب کہاں

وہی مذاقِ طلب ہے وہی خلوصِ عمل
حریف کا ہے لیکن یہ دورِ کم نظراں

یہ سعیِ ضبطِ جنوں کا ہے کون سا پہلو
مچل رہی ہے طبیعت بدل رہا ہے سماں

یہی بہت ہے کہ وضعِ چمن بحال رہے
مجھے عزیز ہیں دونوں بہار ہو کہ خزاں

زوالِ فکر کے اسبابِ نو بہ نو شاہد
نہیں کچھ اور بجز اندیشہ ہائے سود و زیاں

○

تیز طوفاں ہے تُند ریلے ہیں
ہم نے برسوں یہ کھیل کھیلے ہیں

ہر نئے دور کے نقیبوں نے
غم سہے ہیں عذاب جھیلے ہیں

دیکھئے اہتمامِ جشنِ بہار
ہر طرف آنسوؤں کے میلے ہیں

اِنقلابات، حادثے، طوفاں
زندگی کے حسیں جھمیلے ہیں

کیوں نہ لیں جائزہ بہاروں کا
ہم بہت بجلیوں سے کھیلے ہیں

دیکھئے کب ہو موجِ غم پایاب
وقت کے بے پناہ ریلے ہیں

ایک دُنیا ہے ہمنوا شاھد
یہ نہ سمجھو کہ ہم اکیلے ہیں

—

○

کچھ حسیں یادیں بسا اوقات آتی رہ گئیں
آندھیوں میں بھی یہ شمعیں جھلملاتی رہ گئیں

جن مقدس واردانوں سے عبارت ہے حیات
جب کبھی یاد آ گئیں بس یاد آتی رہ گئیں

کچھ امنگیں تھیں جنھیں جھٹلا دیا حالات نے
کچھ تمنائیں دلوں کو گدگداتی رہ گئیں

حادثے ٹل بھی گئے لیکن بہ اندازِ جنوں
ذہن میں کچھ الجھنیں سی نفسیاتی رہ گئیں

گردشِ دوراں کہاں شاہد کہاں یہ دورِ جام
گردشیں بھی گردشوں کے گیت گاتی رہ گئیں

○

مسکراؤ کہ غم کے سائے ڈھلیں
آبھی جاؤ کہ حادثات ٹلیں

نا قدینِ وسیلۂ منزل
دو قدم تو کسی کے ساتھ چلیں

روشنی دُور دُور تک پہنچے
آنسوؤں کے اگر چراغ جلیں

تم بساطِ نظر پہ چھاتے رہو
حادثے چاہے پھر ٹلیں نہ ٹلیں

جادۂ ارتقاء پہ عقل و جنوں
مصلحت یہ ہے ساتھ ساتھ چلیں

جن عناصر سے دِل عبارت ہے
اب وہ شاید چراغ بن کے جلیں

راز وہ راز ہی نہیں شاھد
جو دلِ کائنات میں نہ پلیں

○

لبوں پہ آج وہ پہلی سی موجِ رنگ نہیں
حیات چنگ ہے لیکن نوائے چنگ نہیں

شکستِ دل کی صدا اُن کے جھومنے والو
یہ گونج سازِ نفس کی ہے جلترنگ نہیں

ہو جامِ جم بھی تو گردش میں ٹوٹ جاتا ہے
ہزار ضبط کروں پھر بھی دل ہے سنگ نہیں

مزاجِ دل سے شعورِ نظر کو کیا نسبت
معاملاتِ جنوں وجہِ نام و ننگ نہیں

ٹھہر کہ تجھ کو بھی یہ رمزِ عشق سکھلا دوں
جو ہو خلوص تو دامانِ حُسن تنگ نہیں

فقط ہوس پہ ہی آزادیٔ نفس کا مدار
زوالِ فکر ہو یا ارتقاء کی جنگ، نہیں

وہ پَو پھٹی وہ اُجالا ہوا مگر شاھد
دلوں میں آج بھی کوئی نئی اُمنگ نہیں

○

جو پھول یہاں وہاں کھلے ہیں
اور اک نظر کے سلسلے ہیں

کس کس سے کرے نباہ کوئی
شکوے ہیں کہیں، کہیں گلے ہیں

انجامِ وفا پہ ہنسنے والو
یوں بھی تو سنا ہے دل ملے ہیں

وارفتگیٔ نظر سے دل تک
خوش رنگ تمام فاصلے ہیں

منظر تو ہے دلخراش لیکن
خاموش ہوں ہیں کہ لب سلے ہیں

پابند ہیں دل کی دھڑکنیں بھی
یہ میری وفاؤں کے صلے ہیں

یہ گردشِ وقت ہے کہ شاہدؔ
کچھ برق خرام قافلے ہیں

○

ضبطِ غم بھی ہے جنوں گریۂ پیہم بھی جنوں
دل ہے ناواقفِ اظہارِ تب و تابِ دروں

کہیں اشکوں کا تلاطم ہے کہیں بارشِ خوں
آدمیّت ہے بہر گام ابھی خوار و زبوں

انقلابات کے باوصف نظر آتے ہیں
ہر طرف تلخیِ حالات کے اسباب فزوں

کچھ نئے نقش اجاگر بھی ہوئے مٹ بھی گئے
سوگوار آج بھی ہر پھول ہے ہر جامِ نگوں

مشتعل ہوں تو ستارے بھی شرارے بن جائیں
ضبط کی حد سے گذر جائے نہ ادراکِ جنوں

آئینے ٹوٹ بھی سکتے ہیں اشاروں سے مگر
مصلحت کا یہ تقاضا ہے کہ خاموش رہوں

میرے افکار و تخیل کو نہ محبوس کرو
کہ ہوں میں شاہد و پیغامبرِ امن و سکون

○

ہمیں نہ چھیڑیئے ہم چوٹ کھائے بیٹھے ہیں
کہ انقلاب کی تہمت اٹھائے بیٹھے ہیں

جو حادثات سے نظریں ملائے بیٹھے ہیں
نیا جہان نئی دنیا بسائے بیٹھے ہیں

تری نگاہ کی حیرت سے آشکارا ہے
وہ راز، دل میں جسے ہم چھپائے بیٹھے ہیں

فرازِ وقت نے سونپا جنھیں نظامِ چمن
رُوِش روِش وہ نئے گل کھلاتے بیٹھے ہیں

کرن کرن کو نہ ترسے گی اب حیات کہ ہم
پلک پلک پہ ستارے سجائے بیٹھے ہیں

عظیم ہیں وہ مسافر جو شوقِ منزل ہیں
متاعِ ہوش تک اپنی لٹائے بیٹھے ہیں

اُٹھیں گے حشر اٹھا کر یہاں سے اب شاہدؔ
چمن سے آج قفس میں جو آئے بیٹھے ہیں

○

مے وہی ہے یہ جام بدلے ہیں
وارداتوں کے نام بدلے ہیں

صرف صیّاد پر ہی کیا موقوف
سب زمیں رنگ فام بدلے ہیں

زندگی داغ داغ ہے اب بھی
حادثے ناتمام بدلے ہیں

گردشوں نے مرے مقدر کے
فیصلے صبح و شام بدلے ہیں

کاروانِ حیات نے اب تک
کیسے کیسے مقام بدلے ہیں

ہو نہ مایوس وقت نے شاہد
ایسے کتنے نظام بدلے ہیں

—

د
ہ
ی
پے



○

چلے ہیں وہ بھی غموں سے فراغ پانے کو
جو اتفاق سمجھتے تھے تازیانے کو

جمالِ دوست پھر اک واردات ہو جائے
ترس گئی ہیں نگاہیں کسی فسانے کو

چراغ جلتے رہیں منزلیں اداس نہ ہوں
زمانہ اپنی طرف پھر ہے لوٹ آنے کو

نظر بچا کے نکل جا غمِ جہاں سے، ابھی
کئی مقام پڑے ہیں فریب کھانے کو

نگاہ جب بھی کسی موڑ پہ جھجک کے رُکی
ہزار نقش اُبھر آئے آزمانے کو

خرد کی راہبری میں بھٹک گئی تھی حیات
جنوں نے بڑھ کے سہارا دیا زمانے کو

ہوئے بہ جبر جو آغاز آشنا شاہد
وہ قافلے ہیں کہیں تھک کے بیٹھ جانے کو

○

قحطِ خوباں قحطِ مستی ہے یارو
یہ بستی بھی کوئی بستی ہے یارو

سرِ مستی کی تہمت کون اپنے سر لے
محفل محفل ہوش پرستی ہے یارو

دیوانے ہوں یا فرزانے ہوں سب پر
یہ دُنیا آوازے کستی ہے یارو

جلتی دُھوپ اُگلی ہے ڈھلتے سایوں نے
کرنوں سے بھی آگ برستی ہے یارو

جس سے آگے ہو پرواز پہ پابندی
ہر وہ بلندی گویا پستی ہے یارو

اُف یہ حالات یہ سماں لوگو
زیست ہے کتنی سرگراں لوگو

تھی وہیں شاخِ آشیاں پہلے
اُٹھ رہا ہے جہاں دھواں لوگو

وقت جیسے ٹھہر ہی جائے گا
اب تو ہوتا ہے یہ گماں لوگو

آپ بیتی نہ کوئی جگ بیتی
کس لیے چُپ ہوئے زباں لوگو

کس طرح غم کی رات گزُرے گی
چھیڑ دو کوئی داستاں لوگو

○

شعورِ زندگی ہے مائلِ رم دیکھئے کیا ہو
تغیر آشنا ہے نظمِ عالم دیکھئے کیا ہو

سجائے ہیں سرِ مژگاں چراغِ آگہی میں نے
تماشا بن گئی ہے چشمِ پُر نم دیکھئے کیا ہو

حجابِ درمیاں ٹوٹا ہے قدروں کے تصادم سے
جنون و عقل میں ہے فاصلہ کم دیکھئے کیا ہو

چراغِ مصلحت گُل کر کے اب دیوانے آئے ہیں
بدلنے کو ہے پھر تقدیرِ آدم دیکھئے کیا ہو

رہے ہے جو عمر بھر ناواقفِ اسرارِ میخانہ
تصرف میں ہے اُن کے ساغرِ جم دیکھئے کیا ہو

قدم لینے کو آتے ہیں ستارے آسمانوں سے
ہماری لغزشِ پیہم ہے اور ہم دیکھئے کیا ہو

پرافشاں ہیں بساطِ عہدِ نو پر ظلمتیں اب تک
یہ جنت ہے تو پھر شاہد جہنم دیکھئے کیا ہو

○

وہ برق جو مرے خرمن میں ڈھونڈھتی تھی پناہ
مری ہی شاخِ نشیمن پہ ہے اب اُس کی نگاہ

فغاں، کہ اُن کے تصرّف میں ہے بہارِ چمن
نہیں جو اہلِ چمن کے مزاج سے آگاہ

جو اِک جھلک میں ستارے تراش لیتا ہے
اُسی تبسّم پنہاں کی منتظر ہے نگاہ

وہ قافلے کہ جنھیں رہبروں نے لوٹا تھا
ہوئے ہیں گرمِ سفر آج پھر بہ حالِ تباہ

رہِ طلب میں نگاہیں بھی عام ہیں دل بھی
سوال یہ ہے کہ کس کس سے کیجئے گا نباہ

چلے بھی آؤ کہ ماحول انتظار میں ہے
گذر بھی جاؤ کہ ہے کائنات چشم براہ

جنوں نے کتنی حسین بستیاں بسائی ہیں
یہ نو بہار ہے شاہد یہ روشنی ہے گواہ

○

برہم ہے کیوں ابھی سے نظامِ سحر، نہ پُوچھ
مجھ سے نوائے نیم شبی کا اثر نہ پُوچھ

اک سازِ زندگی ہے اک آوازِ بازگشت
افسانۂ عروج و زوالِ نظر نہ پُوچھ

بیٹھے ہیں کس خیال میں آشُفتہ حال، دیکھ
بیتی ہے کیا کسی پہ سرِ رہگذر، نہ پُوچھ

ہر شاخِ گُل ہے حلقۂ دامِ قفس، یہ مجھے
کیا شے ہے بے بضاعتیِ بال و پر، نہ پُوچھ

ڈر ہے خزاں سرشت نہ ٹھہرے بہار بھی
بدلا ہوا ہے رنگِ چمن کس قدر، نہ پوچھ

روداد درد ہی سببِ چشمِ تر نہیں
کہنے کو اور بھی ہے بہت کچھ، مگر نہ پوچھ

منزل تمام سلسلۂ گیر و دار ہے
شاہد مآلِ چشمِ حقیقت نگر، نہ پوچھ

○

ہے قریب جس سے منزل، ہے نثار جس پہ جادہ
وہ تری روا روی ہے کہ مرا خرام سادہ

تری بخشش و کرم کے یہ عجیب سلسلے ہیں
کہیں تار تار دامن، کہیں زر فشاں لبادہ

تب و تابِ آگہی پہ، رہ و رسمِ زندگی پہ
ترا اختیار کم ہے، مری دسترس زیادہ

یہ جہانِ میکدہ ہے کہ اجاڑ کوئی بستی
نہ شعارِ کیف و مستی، نہ چراغِ جام و بادہ

ہے جہانِ آفرینش مرے حلقۂ اثر میں
وہ مرا ہی فیصلہ ہے جو ہے وقت کا ارادہ

مجھے مہر و ماہ و انجم سے کوئی غرض نہیں ہے
میں چراغِ راہ کی لَو سے کروں گا اِستفادہ

یہ اُفق یہ کہکشاں کیا، یہ فضائے بیکراں کیا
کہ یہ مرحلے تو ہم نے کیئے طے بلا ارادہ

ٹھہر اے غمِ زمانہ، کوئی فیصلہ تو کرلیں
تری وسعتیں بہت ہیں کہ ہے دل مرا کُشادہ

جو کرن کرن کو ترسے اُنھیں کیا خبر کہ شاہد
شبِ تار کے جلو میں ہے سحر بھی ایستادہ

○

لالہ و یاسمن پہ کیا گذری
فصلِ گُل میں چمن پہ کیا گذری

کیا ہوا عنبریں فضاؤں کو
وقت کے بانکپن پہ کیا گذری

سایۂ زُلف ہے نہ کیفِ نظر
عہدِ گل پیرہن پہ کیا گذری

رس نہیں سانولی گھٹاؤں میں
گیسوئے پُرشکن پہ کیا گذری

اب وہ کیفیتِ شباب کہاں
نگہِ سحر فن پہ کیا گذری

جل رہے ہیں پلک پلک پہ چراغ
خلوت و انجمن پہ کیا گذری

ظلمتِ شب تو مٹ گئی لیکن
صبحِ جلوہ فگن پہ کیا گذری

اِس نئے انقلاب سے شاہد
کیا بتائیں وطن پہ کیا گذری

○

آخر ہے کوئی حد بھی گمان و قیاس کی
تصویر بن گیا ہوں میں اُمید و یاس کی

ہے گریۂ سحر بھی نمودِ سحر کے ساتھ
انساں نے کس بھرم پہ اُجالوں کی آس کی

کوئی ادا شناسِ غمِ دل نہیں رہا
ورنہ جنوں دلیل ہے ہوش و حواس کی

اچھے رہے جو کوئی تمنّا نہ کر سکے
بیچارگی تو دیکھ دلِ غم شناس کی

شاہد جب اعتمادِ بہاراں ہی اٹھ گیا
کلیوں نے کس امید پہ کھلنے کی آس کی

○

تا بہ کے لذّتِ گراں خوابی
زندگی ہے تمام بے تابی

اجنبیّت سی ہے بہاروں میں
عارضی ہے چمن کی شادابی

ہائے ذوقِ طلب کی محرومی
وائے جنسِ وفا کی نایابی

برق وش ہے مزاجِ حسن تو کیا
فطرتِ عشق بھی ہے سیمابی

آج فرمانِ وقت سے شاہد
ہے کسی کو مجالِ سرتابی

○

فضاؤں پہ تعطّل سا ہے طاری
نہ جانے اب ہے کس طوفاں کی باری

ہمیں پر آج اُن کی تہمتیں ہیں
ہمیں نے زندگی جن کی سنواری

شبِ آلام کٹتی جا رہی ہے
غمِ ایّام کی پلکیں ہیں بھاری

خزاں کے سائے کب ڈھلتے ہیں یکھیں
چلی تو ہے ذرا بادِ بہاری

وہاں انصاف کا کیا کام شاہد
جہاں قانون بھی ہو اختیاری

○

گردشِ دوراں سے بچنے کی راہ جہاں مسدود ہوئی
آنکھ بچا کر دنیا تری بزم میں آ موجود ہوئی

لاکھ کمندیں پھینکے زمانہ، وقت کہیں ہاتھ آیا ہے
یہ وہ حقیقت ہے کہ اِدھر ابھری تو اُدھر مفقود ہوئی

فکر و نظر میں رنگِ تفاوت دیکھنے والے کیا جانیں
گم ہو کر کونین کی وسعت کیوں دل تک محدود ہوئی

ذہنوں کا اُلجھاؤ کیسا یہ ساری تاویلیں ہیں
بات وُہی دُنیا نے چھیڑی جو تیرا مقصود ہوئی

زیست حوادث کے مبہم پیچاک میں جب اُلجھی شاہد
کروٹ لی تاریخ نے ایسی، وجہِ ہست و بُود ہوئی

○

جگہ تیری ترے رندوں نے لے لی
بس اب ساقی ترا اللہ بیلی

کھلے عقدے کشا کشہائے غم کے
جب انگڑائی مرے جذبات نے لی

معمّہ ہے اگر نیرنگِ دُنیا
تو ہے یہ زندگی بھی اِک پہیلی

نہ کہتے ناخدا تجھ کو اگر ہم
تو کشتی پار ہو جاتی اکیلی

کسی کی راہ میں بکھرے ستارے
کسی کی زندگی اشکوں سے کھیلی

اٹھی کس کی نگاہِ بے محابا
فضا سرشار ہے رُت ہے نشیلی

سماں پھر بھی نہ بدلا گرچہ شاہد
مصیبت جو بھی آئی ہم نے جھیلی

○

گُنجِ غم ہو کہ مسندِ شادی
چاہئیں کچھ اُصول بُنیادی

مصلحت کے چراغ گُل کر دو
ہم نہیں ہیں گریز کے عادی

حاشیوں تک جو داستاں تھی رقم
شرح اُس کی ہے آج فریادی

آتشِ گُل سے جل رہا ہے چمن
دیدنی ہے بہارِ آزادی

ہم نے حالات کے تعاقب میں
آسماں تک شراب چھلکا دی

○

حیات کو نہ کہیں روشنی کی راہ ملی
اگر ملی تو خرابات ہی پناہ ملی

نہ راس آئی جسے تنگنائے دیر و حرم
اُس آرزو کو مرے دل کی بارگاہ ملی

ترا خیال رہا عمر بھر عزیز مجھے
وگرنہ یوں تو بہت فرصتِ نگاہ ملی

چلے جو راہبروں کے غلط اشاروں پہ
رہِ طلب میں اُنھیں صرف گردِ راہ ملی

خرامِ وقت کی آہٹ میں اے غمِ دوراں
تری خبر بھی زمانے کو گاہ گاہ ملی

سحر کی کھوج میں جو پیش پیش تھے شاهد
سحر کے نام سے اُن کو شبِ سیاہ ملی

○

زلفِ ہستی جب بھی سلجھائی گئی
شانۂ گیتی پہ لہرائی گئی

تیرگی جب خوب پھیلائی گئی
مانگ کر کچھ روشنی لائی گئی

ہم نہیں پابندِ آوازِ جرس
اب وہ رسمِ جادہ پیمائی گئی

جو نوا سنجانِ گلشن تھے اُنھیں
ہر جگہ زنجیر پہنائی گئی

گلشنوں میں اب کے یوں آئی بہار
لوٹ کر پھولوں کی رعنائی گئی

جو نظر اُلجھی حجابِ راز سے
موردِ الزام ٹھہرائی گئی

آؤ شاہد وہ کھلونے توڑ دیں
زندگی جن سے نہ بہلائی گئی

○

سفینہ نذرِ ہے موجِ بلا کی
تجھے ہم ناخدا سمجھے خطا کی

ہوئی جرأت نہ عرضِ مدّعا کی
تمھاری آرزو کی بھی تو کیا کی

زمانہ غور سے سنتا ہے جس کو
وہ دھڑکن ہے دلِ درد آشنا کی

حبس ہیں سلسلے دار و رسن کے
چلی ہے بات پھر رسمِ وفا کی

بہت مشکل ہے منزل تک پہنچنا
نظر تم پر ہے اب تک رہنما کی

گماں ہیں سو طرح کے اب دلوں میں
کوئی توضیح کر جرم و سزا کی

کریں ذکرِ غمِ دوراں جو شاہد
انھیں کہتی ہے دنیا اشتراکی

○

مسکرا دیں چاندنی راتیں، بہار آ ہی گئی
ہو گئیں پوری مناجاتیں، بہار آ ہی گئی

لالہ زاروں کا تنوّع، ماہ پاروں کا خرام
لے کے یہ انمول سوغاتیں، بہار آ ہی گئی

پھر گلابی آنچلوں سے ہو گئی رنگیں فضا
پھر ہوئیں پھولوں کی برساتیں، بہار آ ہی گئی

عقل سے بڑھنے لگے پھر اختلافاتِ جنوں
پھر ہوئیں جلووں کی خیراتیں، بہار آ ہی گئی

بے تکلف چھیڑ دی ہیں پھر عروسِ وقت نے
کچھ ترنم آفریں باتیں، بہار آ ہی گئی

یہ فروغِ لالہ و گُل، یہ ہجومِ دلبراں
ہیں نگاہوں کی مداراتیں، بہار آ ہی گئی

یوں رواں ہیں سوئے گلشن مہوشوں کے قافلے
جس طرح تاروں کی باراتیں، بہار آ ہی گئی

مہکا مہکا سا تنفس، بہکی بہکی سی نظر
ہیں سرِ راہے مُلاقاتیں، بہار آ ہی گئی

چھوڑ فکرِ گردشِ ایام شاہدؔ چھیڑ دے
تُو بھی زُلف و جام کی باتیں، بہار آ ہی گئی

○

شمع بھی جس بزم میں پروانہ تھی
وہ تری ہی محفلِ جانانہ تھی

راہبر خود لغزشِ مستانہ تھی
ہائے کیا شے جرأتِ رندانہ تھی

لے اڑی مجھ کو جہانِ ہوش سے
وہ نگاہِ ناز جو صہبانہ تھی

وقت کی گردش بھی رندوں کے لئے
بیخودی میں گردشِ پیمانہ تھی

میرے گرد و پیش تیرا حُسن تھا
یا تمنائے دلِ دیوانہ تھی

وہ بھی کیا دن تھے کہ فرطِ شوق سے
دل کی ہر دھڑکن ترا افسانہ تھی

حیرتِ آئینہ شاہد ہے کہ دوست
میری ازخود رفتگی بے جا نہ تھی

جو کھل کھیلتی تیری آنکھوں کی مستی
کہیں پھول اڑتے، کہیں مے برستی

مرے دل کا حال اپنی آنکھوں سے پوچھ
بسا کر اجاڑی گئی ہے یہ بستی

ہم اس کا مسلسل اعادہ کریں گے
اگر جرم ہے رسمِ گلشن پرستی

یہ ثابت ہوا دوستوں کی روش سے
کہ اک ناسزا جرم ہے تنگدستی

اگر عام ذوقِ طلب ہو تو شاھد
محیطِ نظر ہو بلندی نہ پستی

—

○

روسست ہو موجۂ نفس کی
یہ بات نہیں کسی کے بس کی

بے وجہ نہیں سکوتِ محفل
انساں نے خود اپنی پھر ہوس کی

صورت گرِ کائنات تھا میں
اب سرد سی آنچ ہوں نفس کی

رکھی ہے چمن میں بجلیوں نے
بنیادِ جہانِ خار و خس کی

پرواز کا اہتمام، توبہ!
ہر سانس ہے داستاں قفس کی

اے ذوقِ جنوں کوئی کرشمہ
سوجھی ہے خرد کو پیش و پس کی

ہر دل میں کہاں گداز شاہد
یہ شے نہیں ہر کسی کے بس کی

○

فریبِ ذوقِ سفر ہی نہیں کچھ اور بھی ہے
حیات خوابِ نظر ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

زہے خیالِ حبیب، اے عروسِ شامِ فراق
ترے جلو میں سحر ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

رُخِ حیات پہ یہ مسکراہٹوں کا فسوں
کمالِ شعبدہ گر ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

نوائے نیم شبی، آہِ صبحگاہی میں
خلوص ہو تو اثر ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

ستائشِ غمِ جاناں کے گیت گا کہ یہ غم
حدیثِ دیدۂ تر ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

مرے ندیم، مری کاوشِ نظر کا مآل
چراغِ راہگذر ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

فرازِ وقت ہے شاہد کہ کاروانوں کو
نصیبِ گردِ سفر ہی نہیں کچھ اور بھی ہے

○

جو نظر بے لوث ہے بے لاگ ہے
شعر ہے، نغمہ ہے، لے ہے، راگ ہے

تیرے دامن میں بھی اے صبحِ بہار
سُرخ پھولوں کی بجائے آگ ہے

گلستاں کا پتہ پتہ شاخ شاخ
پھیلتا پھن ہے، لپکتا ناگ ہے

باغ کی ہر شاخ لَو دینے لگی
کیا نویدِ صبح دیپک راگ ہے

جو کبھی شاھد اچھوتا ساز تھی
وہ جوانی اب سُلگتی آگ ہے

رات گذر جانے سے پہلے
ساقی کچھ سن لے کچھ کہہ لے

جو غم ہو ہنس ہنس کر سہہ لے
کھیل سہی جی کچھ تو بہلے

دیکھ کے طوفانوں کے تیور
دل ساحل والوں کے دہلے

ہر شے اپنے مرکز پر تھی
اک تیرے آنے سے پہلے

تفریحاً ہم اکثر شاہد
سطحِ کاہکشاں پر ٹہلے

○

محبّت لطف سے خالی ہے کیا اب بھی نہ آؤ گے
یہ کشتی ڈوبنے والی ہے کیا اب بھی نہ آؤ گے

ستارے جھلملا کر بجھ گئے ہیں اور پھولوں نے
نہ کھِلنے کی قسم کھا لی ہے کیا اب بھی نہ آؤ گے

نہیں تم تو خزاں کا رنگ غالب ہے بہاروں پر
نہ خوشبو ہے نہ ہریالی ہے کیا اب بھی نہ آؤ گے

تمھارے دم سے تھا سب کچھ نہیں تم تو گلستاں سے
گریزاں دورِ خوش حالی ہے کیا اب بھی نہ آؤ گے

نہیں ملنے کی اک رنگیں تمنا ہم نے سینے میں
نہایت شوق سے پالی ہے کیا اب بھی نہ آؤ گے

نیا ماحول ہے قدریں نئی ہیں آج پھر ہم نے
چمن میں طرحِ نو ڈالی ہے کیا اب بھی نہ آؤ گے

ہر اک تہمت ہر اک الزام شاہد کو مبارک ہو
یہ حالت اس نے اپنا لی ہے کیا اب بھی نہ آؤ گے

—

○

ظلم صیّاد نے زنداں میں جو ڈھا رکھا ہے
باغباں نے وہی گلشن میں روا رکھا ہے

ہر نئی راہ پہ جو پھیل کے ہوتا ہے محیط
آج پھر وقت نے وہ دام بچھا رکھا ہے

ضبط کو مصلحتِ عشق سمجھنے والے
دِل میں اِک غم ترے غم سے بھی سوا رکھا ہے

گردشِ وقت کو رندوں نے بہ فیضِ مستی
جھوم کر گردشِ پیمانہ بنا رکھا ہے

صرف احساس کی شدّت سے جسے غربت نے
گردشِ وقت کی نظروں سے بچا رکھا ہے

ہم خراباتِ نشینوں سے نہ اُلجھے کوئی
ہم نے ہنستا ہوا ماحول بسا رکھا ہے

آدمیت ہو تو میخانہ بھی جنّت بن جائے
ورنہ شاہدِ حرم و دیر میں کیا رکھا ہے

○

ہر زباں پر مرا فسانہ ہے
یہ مرے غم کا شاخسانہ ہے

برق کس کس کو اب جلائے گی
شاخ شاخ اپنا آشیانہ ہے

پھر ہے در پردہ اہتمامِ بہار
گریۂ خوں تو اک بہانہ ہے

غالباً اب مرے ارادوں سے
باخبر گردشِ زمانہ ہے

تا بہ کے کوششِ زباں بندی
ہر نظر میری ناقدانہ ہے

فرد کا اقتدار ختم ہؤا
اب تو جمہور کا زمانہ ہے

جس میں شاہد خلوص شامل ہو
ہر وہ اقدام والہانہ ہے

○

کیفِ مستقل ساقی، رُت بدلنے والی ہے
مسکرا کے مل ساقی، رُت بدلنے والی ہے

کچھ چراغ روشن ہیں بھیگی پلکوں پر
غم ہے معتدل ساقی، رُت بدلنے والی ہے

میں ہزار آنکھوں سے بدگماں سہی، لیکن
کہہ رہا ہے دل ساقی، رُت بدلنے والی ہے

وقت سے نہیں ہوتی ضابطوں کی پابندی
ہو نہ مضمحل ساقی، رت بدلنے والی ہے

زندگی پہ حاوی ہیں آج کچھ نئی قدریں
کون ہو مخل ساقی، رُت بدلنے والی ہے

دیکھ تیری محفل میں شاہدِ بہار آیا
پھول بن کے کھل ساقی، رُت بدلنے والی ہے

—

○

جو دل سے رشتۂ غم استوار کر لیں گے
کوئی علاجِ غمِ روزگار کر لیں گے

ہزار طور بدل اے غمِ جہاں تجھ سے
ہم انتقام نیا رُوپ دھار کر لیں گے

سرشتِ حُسن میں خُوئے وفا کہاں پھر بھی
بقدرِ ذوقِ طلب اعتبار کر لیں گے

سماں بدل کے رہے گا اُسے بدلنا ہے
بہت ہُوا تو کچھ اور انتظار کر لیں گے

ٹھہر عروسِ چمن جو ہیں تیرے دیوانے
خراج تجھ سے ہی تجھ کو سنوار کر لیں گے

ہُوئی جو گردشِ حالات راہ میں حائل
تو ہم بھی طرزِ جنوں اختیار کر لیں گے

گرانیٔ شبِ غم بڑھ گئی اگر شاھدؔ
تو ہم سحر کے تصوّر سے پیار کر لیں گے

—

○

راہزن بن کے راہبر گزرے
قافلے کتنے بے خبر گزرے

حادثے راہِ عشق میں کیا کیا
دل پہ گزرے نگاہ پہ گزرے

گر یہی ہے سحر تو اہلِ نظر
اعتبارِ نظر سے در گزرے

محفلِ کہکشاں سے خاک نشین
جب بھی گذرے بیک نظر گذرے

مصلحت کی حدُود سے اکثر
ہنسنے والے بچشمِ تر گذرے

خامشی بے سبب نہیں شاھد
زندگی آج کچھ نہ کر گذرے

○

مہیب سائے شبِ انتظار کے نہ ڈھلے
چمک چمک کے ستارے بھی اب تو ڈوب چلے

تغیرات کے آگے کوئی ٹھہر نہ سکا
کئی چراغ بجھے اور کئی چراغ جلے

وفائیں یوں بھی تو الزام ہوتی جاتی ہیں
تری نظر میں بُرے ہیں تو ہم بُرے ہی بھلے

وہ دل ہی کیا جو حریفِ غمِ حیات نہ ہو
وہ غم ہی کیا جو دلِ کائنات میں نہ پلے

مسافروں کو ہے لازم شعورِ منزل بھی
چراغِ راہگذر کیا خبر جلے نہ جلے

وہ انقلاب تو تہمت ہے انقلاب نہیں
جس انقلاب کے باوصف حادثے نہ ٹلے

یہ اور بات ہے شاہد نکھار آ نہ سکا
رُخِ حیات پہ کیا کیا نہ ہم نے رنگ ملے

○

جو بہاروں کی گود میں جھُولے
وہ خزاؤں میں بھی پھلے پھُولے

تختۂ اے عروسِ آزادی
موتیوں کی بجائے آنسو، لے

وقت کے بیکراں دُھندلکوں میں
کتنے ادوار راستہ بھُولے

شمع بجھتی دکھائی دیتی ہے
اُٹھ رہے ہیں دھوئیں کے مرغولے

بڑھ رہی ہے نئے چراغ کی لَو
جانے کب وقت کی جبیں چھو لے

کہکشاں تو غبارِ منزل ہے
ہم ابھی راستہ نہیں بھولے

کیا یہی نو بہار ہے شاہد
برقِ غم شاخ شاخ پر جھولے

—

چمن کے نوخیز پھول کب تک شکارِ رنج و محن رہیں گے
اگر کہیں یہ مچل گئے تو بدل کے رنگِ چمن رہیں گے

اٹھی ہیں ادبار کی گھٹائیں، غموں سے کیسے فراغ پائیں
خدا ہی جانے یہ حادثے تا بہ کے نصیبِ وطن رہیں گے

دلوں کی شادابیاں نکھرتی ہیں اور بھی پائمالیوں سے
ہم اہلِ گلشن بہار ہو یا خزاں ہو گل پیرہن رہیں گے

جو باغباں کی نگاہ میں آج خار بن کر کھٹک رہے ہیں
وہ پھول اک دن بہ فیضِ ترتیبِ نو متاعِ چمن رہیں گے

کچھ اس بلندی پہ کر رہے ہیں مقامِ اہلِ جنوں کہ شاہد
نہیں تو اک واہمہ ہیں آئے تو حاصلِ انجمن رہیں گے

—

○

ذوقِ پرواز خار و خس تک ہے
زحمتِ آشیاں قفس تک ہے

حیف وہ قافلے جو یہ سمجھے
آگہی نالۂ جرس تک ہے

وہ کہاں جائیں جن کی نظروں میں
حدِ امکاں ہی پیش و پس تک ہے

خود نمائی ہے اہتمامِ فریب
شوخ پھولوں کا روپ مس تک ہے

احتیاط اے خلوصِ جذبہِ دل
عشق کا سلسلہ ہوس تک ہے

جانے کس راز کا ہے دل غمّاز
اضطرابِ نظر نفس تک ہے

عشق کی مصلحت ہے حُسن نہیں
وہ جو محدود رنگ رس تک ہے

انقلابات کا بھرم شاہد
گرمیِ شورشِ نفس تک ہے

○

جو کائنات کو خود میں سمو نہیں سکتے
وہ رازِ وقت کی تخلیق ہو نہیں سکتے

مسافرو نہ رُکو راستے کے موڑ تھے نہیں
تمام عمر تو کانٹے چبھو نہیں سکتے

وہ مرحلے کہ جلائے گئے چراغ جہاں
ہماری منزلِ مقصود ہو نہیں سکتے

رہِ حیات کے موضوع چھیڑنے والے
غمِ حیات کا اِک داغ دھو نہیں سکتے

بھٹک تو جاتے ہیں درماندہ راہرو لیکن
غبارِ منزلِ جاناں میں کھو نہیں سکتے

وہ انقلاب ہی کیا جس کے تُندرَو ریلے
سُبک خرام سفینے ڈبو نہیں سکتے

حیات خواب نہیں ہے یقیں بھی کر شاہد
کہ سونے والے بہت دیر سو نہیں سکتے

○

اُلجھ کر اعتمادِ رہرواں سے
بچھڑ جائیں نہ رہبر کارواں سے

گذر جا سرحدِ وہم و گماں سے
یہ پردے بھی اٹھیں اب درمیاں سے

وہی تھی منزلِ مقصود اُن کی
مسافر بے خبر گذرے جہاں سے

ق

یہ کیسی سازشیں کیں بجلیوں نے
بہار آنے سے پہلے باغباں سے
کہ فصلِ گُل کے آتے ہی چمن میں
دھواں اُٹھنے لگا ہر آشیاں سے

چلا اُن کے اشاروں پہ زمانہ
جو در گُذرے غمِ سُود و زیاں سے

وہیں پھر آ رُکے ہم آج شاھدؔ
چلے تھے شوقِ منزل میں جہاں سے

○

یوں کھل کے مرے باغ کے مرجھا گئے پودے
ہنستے ہوئے ماحول میں جیسے کوئی روئے

یہ مصلحت اندیشیِ ہنگامۂ دوراں
دکھے ہوئے احساس کو نشتر نہ چبھوئے

منزل ہی نہیں حاصلِ رفتارِ زمانہ
اے جادۂ نو جو ترے مقدور میں ہوئے

یوں مرحلہ پیما ہیں نئے دور کے راہی
ہر گام پہ منزل کے لئے ہوتے ہیں سودے

ڈر ہے کہیں سہمے ہوئے احساس کا پرتو
پیراہنِ زرتار میں آنسو نہ پرو دے

تاریخ نچوڑے اگر ادوار کا دامن
کتنے ہی سبکسار سفینوں کو ڈبو دے

اِک خوف سا لرزاں ہے حوادث کے لبوں پر
ماحول کہیں وقت کی پلکیں نہ بھگو دے

میں گردشِ ایام سے بھاگ آیا ہوں شاہدؔ
پھر کوئی مجھے ساغر و مینا میں ڈبو دے

○

نا موافق جو رُخ ہوا کا ہے
ہاتھ کچھ اس میں نا خدا کا ہے

آشیاں کو چُنے تھے جو تنکے
پھر اُنھیں بجلیوں نے تاکا ہے

زندگی کا بھرم نہیں کھُلتا
گونج ہے یا فقط چھناکا ہے

کوئی اقدام اے مذاقِ جنوں
ہر قدم پر خطر و کا ناکا ہے

وقت پر منحصر نہیں کچھ بھی
وقت طرزِ عمل کا خاکا ہے

مبتلائے غمِ حیات سہی
پھر بھی دل شوخ انتہا کا ہے

مُہر بر لب ہیں اہلِ دل شاہد
یہ صلہ عرضِ مدّعا کا ہے

○

دیکھنے کو تو بہت کچھ تھا مگر کیا دیکھتے
ہم بہ ایں آویزشِ قلب و نظر کیا دیکھتے

ڈھل گئی کب رات کب آئی سحر کیا دیکھتے
اپنے گردو پیش سب کچھ ہار کر کیا دیکھتے

تھا چمن میں فصلِ گل کا دور دورہ پھر بھی ہم
خندۂ گل کو بقیدِ چشمِ تر کیا دیکھتے

حد سے بڑھ کر درد کو خود ہی دوا ہونا پڑا
سعیِ درماں تک تری اے چارہ گر کیا دیکھتے

جن کو آہِ صُبحگاہی سے نہ فرصت مل سکی
وہ دُعائے آخرِ شب کا اثر کیا دیکھتے

ہم نے منزل کو بہ ربطِ شوق آخر جا لیا
اور تیری راہ اب اے راہبر کیا دیکھتے

شُکر ہے راہِ طلب میں بے خودی کام آ گئی
آگے آگے ورنہ شاہد کیا خبر کیا دیکھتے

○

تشنہ لب بیٹھے رہو گے تا بہ کے
چھین لو ساقی سے بڑھ کر جام مے

ہیں شکستِ ساز کا قائل نہیں
دائمی ہوتی ہے ہر نغمے کی نے

رہبروں کو دور سے پہچان کر
مرحلے کچھ دل نے کر ڈالے ہیں طے

ہم کھلی آنکھوں یہ دھوکا کھا گئے
صبحِ نو پر سایۂ شبرنگ ہے

یہ تسلسل دیکھئے کب تک رہے
امتحانِ آرزو ہے پے بہ پے

دہر میں ہر ناگہاں غم کا علاج
آج بھی شاہدؔ شرابِ ناب ہے

○

جہاں کہیں بھی ترے خانماں خراب گئے
مہ و ستارہ و خورشید ہمرکاب گئے

بطرزِ نغمۂ بُلبل برنگِ حُسنِ بہار
ہر ایک سمت سفیرانِ انقلاب گئے

جنونِ شوق نے بدلی روش تو دیوانے
اُلٹ کے گردشِ حالات کا نقاب گئے

جو حادثات بھی راہِ طلب میں پیش آئے
دلوں کو بخش کے بیداریوں کے خواب گئے

بدل کے صنفِ غزل کا مزاج ہم شاہدؔ
ہر انجمن میں لئے تازہ آفتاب گئے

○

فیض ساقی کا یہ نرالا ہے
جام میں گردشوں کو ڈھالا ہے

غم نے رہ رہ کے دل پہ یورش کی
میں نے ہنس ہنس کے غم کو ٹالا ہے

زندگی اُس مقام پر ہے جہاں
تیرگی ہے نہ اب اُجالا ہے

وقت نے بارہا زمانے کو
بحرِ ظلمات سے نکالا ہے

وہ بھی انساں ہیں زندگی جن کی
سربسر آنسوؤں کی مالا ہے

آدمیّت کا احترام کرو
آدمیّت کا بول بالا ہے

ہیں وہ خود رو گلاب ہوں شاہد
جس سے گلشن مہکنے والا ہے

○

نگاہِ شوق جہاں خود پرست ہوتی ہے
اُسی مقام پہ دل کو شکست ہوتی ہے

یہ راز، چوٹ لگے دل پہ جب تو کھُلتا ہے
کہ زندگی بھی کبھی زیردست ہوتی ہے

چمن سے جب بھی گزرتا ہے تشنہ کام کوئی
کلی جو کھلتی ہے ساغر بدست ہوتی ہے

حریفِ گردشِ دوراں تو ہیں سبھی لیکن
کسی کو فتح، کسی کو شکست ہوتی ہے

سحر کے بعد ستاروں کی چال سے شاہدؔ
کھُلا بھرم کہ بلندی بھی پست ہوتی ہے

○

ساقی بہارِ نو ہے چمن ہیں ہرے بھرے
تجھ سے کوئی شراب نہ مانگے تو کیا کرے

روشن کیے ہیں میں نے سرِ راہ وہ چراغ
کرتے ہیں جن سے چاند ستارے بھی مشورے

آوارۂ حیات ہوں، آوارۂ مقام
منزل مری ہے سرحدِ ادراک سے پرے

گو کھینچ دیں خرد نے تفاوت کی کچھ حدیں
پھر بھی ہر انجمن میں جنوں نے قدم دھرے

شاہد نہ ہو جو واقفِ اسرارِ میکدہ
ساقی کی احتیاط پہ الزام کیوں دھرے

○

یہ زلزلوں کی ہے جھنکار تا بہ کے نہ سُنیں گے
جو دب گئے وہ زمانے کبھی اُبھر نہ سکیں گے

جنونِ شوقِ فراواں، فسونِ لطفِ خراماں
عروسِ وقت کے لمحات ہم کو یاد کریں گے

وہ نکھرے نکھرے سے عارض وہ بکھرے بکھرے سے گیسو
خیال و خواب کے یہ سلسلے جواں ہی رہیں گے

نظر جھکی تو پڑیں نبضِ آگہی پہ خراشیں
نظر اُٹھی تو کئی انقلاب جاگ اُٹھیں گے

پڑے نہ راہوں پہ تاروں کے اضطراب کا پرتو
تھکے تھکے سے قدم اُٹھ گئے تو پھر نہ رُکیں گے

نفس کی آنچ بھی کافی ہے آج راہِ طلب میں
یہ وہ چراغ ہے جس سے کئی چراغ جلیں گے

ہزار حادثے شاہد ہیں سنگِ راہ تو کیا غم
کہ انقلاب کا مقصد ہے زندگی تو جئیں گے

—

○

سرکشی یا کہ سرگرانی کے
کیا ارادے ہیں زندگانی کے

ہر تبسّم کی تہہ میں ہوتے ہیں
راز غمہائے جاودانی کے

پے بہ پے حادثوں نے سلجھائے
کتنے اُلجھاؤ زندگانی کے

سلسلے عقل سے جنوں تک ہیں
گردشوں کی بہم رسانی کے

ہم نے دیکھے ہیں اے غمِ جاناں
شعبدے جورِ آسمانی کے

انقلاب آفریں بھی ہوتے ہیں
تازیانے غمِ نہانی کے

ایک بھی نکتہ رس نہیں شاہد
مُدّعی سب ہیں نکتہ دانی کے

○

ٹھہر گئے دل اگر، ستاروں سے دھڑکنیں مستعار لیں گے
یہ عہدِ شامِ فراق جیسے بھی بن پڑے گا گذار لیں گے

جو وقت کی بے نشاں خلاؤں میں کھو گئے وہ حسین لمحے
تری رضا ہو تو پھر عروسِ بہار کا رُوپ دھار لیں گے

ابھی تو انسان محو ہے سنگ و خشت کی بے ثباتیوں میں
ابھی تو برسوں ترا سہارا ہم اے غمِ روزگار لیں گے

قدم بڑھا بھی کہ تیرے قدموں کی چند آسودہ لغزشوں سے
کئی نشیب و فراز اپنی روایتوں کو سنوار لیں گے

جنھیں حوادث کی یورشوں نے مسل دیا عہدِ رنگ و بو میں
مرے چمن کے وہ پھول زخمِ خزاں سے درسِ بہار لیں گے

چراغ بجھنے نہ پائیں مایوس ہوں نہ تاریخ کی نگاہیں
مرے ارادے روایتوں کے سبک لبادے اُتار لیں گے

جلا جلا کر نفس نفس کے بجھے بجھے سے چراغ شاہد
جو ماورائے نظر ہیں اب تک وہ نقش بھی ہم اُبھار لیں گے

(محمد اقبال عباسی خوش نویس لاہور)

ایران میں اجنبی

ن ۔ م ۔ راشد

ن ۔ م ۔ راشد کو جدید اردو شاعری میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو قدیم اردو شاعری میں ولی کو نصیب کیا گیا تھا ۔ راشد کے تخیل میں پرواز ہے اور فکر میں ندرت ۔ الفاظ کی تراش حسین ہے اور ترنم سحر آفرین ۔ "ایران میں اج تہذیب و تمدن کی داستان اور تاریخ کا • زریں ہے ۔

قیمت چار روپے

★

گوشۂ ادب ☆ چوک انارکلی ☆ لا

سرورق رہبن پریس ، لاہور میں چھپا